تاریخ اور دانشور

ڈاکٹر مبارک علی

فکشن ہاؤس
18- مزنگ روڈ لاہور

انتساب

خدا کی بستی کے

تسنیم صدیقی کے نام

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	تاریخ اور دانشور
مصنف	ڈاکٹر مبارک علی
پبلشرز	فکشن ہاؤس
	18-مزنگ روڈ' لاہور
	فون: 7249218-7237430
اہتمام	ظہور احمد خاں
کمپوزنگ	فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز	حاجی حنیف پرنٹرز لاہور
سرورق	ریاظ
اشاعت اول	1995ء
اشاعت دوم	2004ء
قیمت	150/- روپے

فہرست

1- پیش لفظ	7
2- تعارف	9

حصہ اول

پاکستانی دانشور

3- ریاست اور دانشور	15
4- آخری عہد مغلیہ کے دانشور	19
5- سید احمد خان اور ان کے ہم عصر	23
6- دانشور اور نظریہ پاکستان	27
7- سرکاری دانشور	31
8- دانشور اور سرپرستی	35
9- دانسور اور مالی مسائل	41
10- بیوروکریٹ دانشور	47
11- دانشور بننے کا شوق	51
12- سیمینار اور دانشور	55
13- دانشور اور انعامات	57
14- جلاوطن دانشور	61
15- کیا ہماری کوئی دانشورانہ روایت ہے؟	63

حصہ دوم

عروج و زوال اور پس ماندگی

1- عروج و زوال کا فلسفہ	71

2 - زوال کا احساس 79

3 زوال کے بدلتے تصورات 87

4 - اصلاحات اور احیاء 93

5 - پاکستانی معاشرہ اور پس ماندگی 99

حصہ سوم

مضامین

1 - علم آثار قدیمہ 105

2 - آثار قدیمہ اور پاکستان 123

3 - نسلی تضادات 127

4 - اسلام اور جدیدیت 137

5 - مسلمان معاشرہ کا مطالعہ 155

6 - قومی ریاست کا عروج و زوال 159

7 - تاریخ اور تحقیق کے مسائل 163

8 - آلو اور اس کے سماجی اثرات 167

9 - روزمرہ زندگی کا نقشہ 173

10 - فرد اور ادارے 183

11 - انتشار : تبدیلی کی علامت 189

12 - سیاست اور سماجی اصلاحات 193

13 - پانچ سو سال بعد 197

14 - شہر اور دیہات 207

15 - خطابات 211

16 - نام میں کیا ہے؟ 215

17 - شریف خاندان	221
18 - نفرت کی سیاست	225
19 - اکبر پاکستانی نصاب کی کتابوں میں	229
20 - تاریخ اور بچپن	235
21 - تاریخ اور آنسو	241
22 - تاریخ اور افواہیں	247
23 - تاریخ اور وقت کا تصور	251

پیش لفظ

اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اس کا پہلا حصہ پاکستان میں دانشوروں کے کردار کے بارے میں ہے۔ دوسرے حصہ میں زوال اور پس ماندگی کے حوالے سے یہ پہلو سامنے آتا ہے کہ دانشورانہ روایات کے فقدان کی وجہ سے پس ماندگی کے عمل کو ہمارے ہاں اب تک نہیں سمجھا گیا ہے۔ تیسرے حصہ میں تاریخ کے متعلق مضامین ہیں' ان میں خصوصیت سے اس بات کی کوشش کی گئی ہے کہ تاریخ کے بارے میں جو نئے نظریات آرہے ہیں' ان میں اردو داں طبقے کو روشناس کرایا جائے۔

مبارک علی

گوئٹے انسٹی ٹیوٹ لاہور

۱۹۹۵ء

تعارف

معاشرے میں دانشور کا کردار انتہائی اہم ہوتا ہے کیونکہ اس کے پاس علم کی طاقت ہوتی ہے' ذہنی فکر اور شعور کی پختگی ہوتی ہے اور ان کی مدد سے وہ معاشرہ کی تبدیلیوں کا تجزیہ کرسکتا ہے۔ اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا دانشور کو ترقی پسند تحریکوں میں شامل ہوکر تبدیلی کے عمل کو تیز کرنا چاہیے یا اسے صرف حالات اور تاریخی عمل کا مشاہدہ کرنا چاہئے اور یا اسے تبدیلی کی قوتوں کو روک کر ٹھہراؤ کی کیفیت کی حمایت کرنی چاہئے؟ معاشرہ میں تینوں قسم کے ہی دانشور ہوتے ہیں اور اپنے نظریات کے سلسلہ میں یہ تینوں ہی اپنا موقف رکھتے ہیں۔

وہ لوگ جو اس پر یقین رکھتے ہیں کہ دانشور کو نئے نظریات اور افکار کو آگے لے کر بڑھنا چاہئے اور ترقی پسند تحریکوں میں شامل ہونا چاہئے' ان کی دلیل یہ ہے کہ علم ایک مرحلہ پر پہنچ کر اپنی افادیت کھو دیتا ہے اور یہ علم ترقی کی بجائے معاشرے کو اور زیادہ پس ماندگی کی جانب لے جاتا ہے لہٰذا ٹھہراؤ اور منجمد کیفیت سے نکالنے کا کام دانشور کرتے ہیں جو علم کو تبدیل ہوتے ہوئے حالات میں استعمال کرکے اس سے مطابقت پیدا کرتے ہیں' جب علم اور معاشرہ دونوں ہی ایک جگہ ٹھہر جائیں گے تو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے تمام راستے بند ہوجائیں گے۔ اس لئے دانشور نہ صرف علم کو متحرک رکھتا ہے بلکہ اس میں فکری اضافے کرکے اسے معاشرے کے لئے مفید بھی بناتا ہے۔

جو لوگ دانشور کے اس کردار کے مخالف ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دانشور کو صرف

مشاہدہ کرنا چاہئے اور کسی تاریخی ایجنٹ کے طور پر کام نہیں کرنا چاہئے یہ دانشور کو ایک خاموش اور غیر متحرک رول دیتے ہیں جو تاریخی عمل سے دور بیٹھا اس کا تجزیہ کر رہا ہے اور اس میں شامل نہیں ہے' ان کے نزدیک شمولیت دانشور کو ایک پارٹی بنا دیتی ہے اور وہ اپنا نیوٹرل کردار کھو بیٹھتا ہے۔

اور وہ لوگ بھی ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ تبدیلی ایک ایسا عمل ہے کہ جو جمی جمائی روایات اور اداروں کو الٹ پلٹ کر انتشار کی کیفیت پیدا کرتا ہے وہ اطمینان جو کہ معاشرہ کو مستحکم روایات میں تھا اس کے ٹوٹنے سے ہر فرد غیر یقینی کیفیت میں مبتلا ہوجاتا ہے' تبدیلی ایک پر تشدد ذریعہ ہے جس کو روکنے کا کام دانشوروں کو کرنا ہے' اگر ان سے یہ سوال کیا جائے کہ یہ مستحکم روایات ایک سطح پر جاکر بے معنی ہوجاتی ہیں اور انہیں کس طرح سے بدلتے ہوئے حالات سے ملایا جائے تو اس کا جواب یہ ہوتا ہے کہ روایات کے ڈھانچہ کو اور ان کی ساخت کو بدلے بغیر ان کو ترقی پذیر خیالات و افکار سے ملانے کی کوشش کرنی چاہئے کیونکہ اگر ہماری روایات ٹوٹ گئیں تو اس صورت میں ہماری کوئی شناخت باقی نہیں رہے گی۔

یہاں یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا شناخت کوئی مستقل چیز ہے یا یہ بھی وقت کے ساتھ بدلتی رہتی ہے؟ ایک ہی معاشرے میں ایک ہی فرد کی شناخت'مذہبی ' لسانی' نسلی اور وطنیت کی بنیاد پر ہوتی ہے اور جب ایک شناخت ختم ہوجاتی ہے تو اس کی جگہ دوسری شناخت لے لیتی ہے۔

معاشرے میں ایک دانشور کا کردار اس وقت ابھر کر آتا ہے جب وہ ذاتی فوائد اور مقاصد سے بلند ہوکر معاشرے کے مسائل پر مصلحت و منافقت کے بجائے حکومت و معاشرے دونوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنائے' یورپ میں چرچ کااقتدار تعلیمی و فکری شعبوں میں اسی وقت ٹوٹا جب دانشوروں نے اس کو چیلنج کرتے ہوئے معاشرے کے لئے ایک متبادل نظام تشکیل دیا۔ ان کے نظام کی بنیاد عقیدت پر تھی ' جس میں اول تھیولوجی کو اس بنیاد پر جانچا گیا اور جب اس کی خامیاں سامنے آئیں تو معاشیات اور

سیاست نے ان سے علیحدگی اختیار کر کے حالات کے تقاضوں کے تحت خود کو منظم کیا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا پاکستانی دانشور تبدیلی کے اس اہم مرحلے پر جب کہ معاشرہ میں ٹوٹ پھوٹ و انتشار ہو رہا ہے' قدیم روایات اپنا اثر کھو چکی ہیں' سیاسی ادارے بدلتے ہوئے حالات کے تحت فرسودہ ہو چکے ہیں اور سماجی و ثقافتی قدریں اپنی افادیت کھو چکی ہیں۔ اپنا کردار ادا کر رہا ہے؟ کیا وہ تبدیلی کے اس عمل کو محض دیکھ رہا ہے یا اسے روکنے کی کوشش کر رہے ہے اور یا وہ تبدیلی اور نئے حالات کے تحت ایک نیا نظام تشکیل دینے کی کوشش میں ہے؟ پاکستانی دانشور اس پورے عمل میں یا تو محض تماشائی ہے اور یا وہ قدامت پرستوں کے ساتھ مل کر حکمراں طبقوں کی خوشنودی میں مصروف ہے۔ سوائے چند افراد کے جو فرسودہ روایات اور نظام حکومت کے خلاف آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔

دانشور کی یہی خاموشی ہے کہ جس کی وجہ سے ہمارا معاشرہ مذہبی تنگ نظری' جنونیت اور انتہاء پسندی کی لپیٹ میں آیا ہے' مذہب کے نام پر خیالات کی آزادی کو دبا دیا گیا ہے اور خود حکومت اس مذہبی جنونیت کے ہاتھوں یرغمالی بن کے ان کے راستے پر چل رہی ہے ان حالات میں چند روشن خیال دانشور خود کو بالکل اکیلا و تنہا پاتے ہیں۔

پاکستانی معاشرہ آج جن حالات سے دوچار ہے اس کے ذمہ دار سیاست دانوں کے ساتھ ساتھ یہ دانشور بھی ہیں کہ جنہوں نے قیام پاکستان کے فوراً" بعد اس ملک کی فکری بنیادوں کو سیکولر اور ترقی پسند روایات پر استوار کرنے کے بجائے حکمران طبقوں کا ساتھ دے کر ان کی جڑوں کو مضبوط کیا اور خود کو اسی قدر کمزور کرلیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں دانشوری کی روایات انتہائی کمزور ہیں اور دانشور آزاد و خود مختار ہونے کے بجائے حکمراں طبقوں کی خوشنودی میں اپنا زور قلم صرف کر رہے ہیں۔

حصہ اوّل

پاکستانی دانشور

ریاست اور دانشور

دانشوروں کا طبقہ تاریخ میں نیا نہیں ہے' بلکہ یہ اس وقت ہی وجود میں آگیا تھا جب کہ انسان نے اس فطرت کے بارے میں معلومات حاصل کرنا شروع کیں' اور ان کا علم آہستہ آہستہ یاداشتوں' زبانی روایات' اور دیومالائی قصوں کے ذریعہ وسیع ہوتا چلا گیا اور انہوں نے خود کو اس علم کا پاسبان و نگہبان بنالیا۔ انسانی معاشرہ کا وہ طبقہ کہ جس کو علم سے واقفیت تھی' اس نے اس کے سہارے نہ صرف سیاسی اقتدار پر قبضہ کیا' بلکہ بعد میں وہ روحانی طاقت کے مالک بھی ہوگئے' اور اس حیثیت سے انہوں نے حکمران' سردار' یا سیاسی راہنما کے ہاتھ بٹائے۔ یہ ضرور ہوا کہ جب سیاسی طاقت مضبوط ہوئی تو اس وقت عالموں کا درجہ اولین کے مقابلہ میں ثانوی ہوگیا' لیکن انہوں نے اپنی برتری کو اس صورت میں برقرار رکھا کہ علم پر اپنی خاندانی' اور طبقہ کی اجارہ داری قائم رکھی' اور کوشش کی کہ اس سے دوسرے طبقے مستفید نہ ہوں' کیونکہ صرف اس صورت میں وہ اپنا اعلیٰ و پراسرار مقام معاشرہ میں رکھ سکتے تھے' اور اسی صورت میں ان کے علم کی ہیبت لوگوں کے دلوں میں رہ سکتی تھی۔

اس لئے بادشاہوں کے درباروں میں برہمنوں' راہبوں' شامانوں اور عالموں کی قدر تھی' دینوی و روحانی علوم کے ماہر ہونے کی حیثیت سے ان کی عزت بھی تھی تو ان سے خوف بھی کھایا جاتا تھا۔ یہ ان کے فرائض میں سے تھا کہ بادشاہوں کی تاجپوشی یہ کرتے تھے' پیدائش سے لے کر موت تک کی رسومات کی ادائیگی ان کے ذمہ تھی' اور مذہبی و ثقافتی تہوار انہیں کی راہنمائی میں منائے جاتے تھے۔

لیکن ایک عرصہ تک حکمرانوں اور دانشوروں کے درمیان یہ مفاہمت نہیں چل سکی۔ کیونکہ ان دانشوروں نے جس طرح سے اپنے علم کو حکمرانوں کی خدمت کے لئے استعمال کیا' اس سے کچھ لوگوں کو ناراضگی ہوئی' اور انہیں لوگوں میں سے دانشوروں کا ایک طبقہ پیدا ہوا کہ جس نے مذہبی رسومات' توہمات اور آداب کا مذاق اڑانا شروع کردیا' انہوں نے عقیدوں پر بھی تنقید شروع کردی اور اس پر تعجب کا اظہار کیا کہ ان کو کیوں کر آنکھیں بند کرکے سچا تسلیم کرلیا جاتا ہے۔ انہوں نے اس بات کا پرچار کیا کہ چیزوں کو صحیح تسلیم کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ اس کی تصدیق کی جائے' جانچ پڑتال کی جائے' اور اسے عقل کی ترازو میں تولا جائے' اس لئے ان کے فلسفہ کی بنیاد شک اور تحقیق پر تھی۔

اس کے بعد سے عقیدہ پرست دانشوروں اور عقل پرست دانشوروں کے درمیان ایک تصادم اور کش مکش شروع ہوگئی جو دنیا کے ہر معاشرہ میں آج بھی کسی نہ کسی شکل میں جاری ہے اس میں ایک طرف سے یہ کوشش ہے کہ لوگوں کو عقیدے کی زنجیر میں باندھ کر غلام بنایا جائے' تو دوسری طرف اس بات کی کوشش ہے کہ انہیں ان بندھنوں سے آزاد کردیا جائے' مثلاً" یونان کے معاشرہ میں دیوجانس' ایپی کیورس اور سقراط پیدا ہوئے کہ جنہوں نے معاشرہ کو عقلیت' آزاد فکر اور سوچ کی طرف ڈالا' تو ہندوستان میں چارواک فلسفی پیدا ہوئے جنہوں نے روحانیت کے خلاف مادی فلسفہ کا پرچار کیا' اسلامی معاشرے کی ابتداء میں معتزلہ مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے وہ لوگ تھے جو یونانی فلسفہ سے متاثر تھے' اور معاشرہ کی مذہبی تنگ نظری کے خلاف رواداری اور آزاد خیالی کو مضبوط کرنا چاہتے تھے۔

ایسے دانشور کہ جنہوں نے معاشرہ کی قائم شدہ روایات کے خلاف بغاوت کی اس کے خلاف آواز اٹھائی' انہیں اس جرم کی سزا میں قید و بند سے لے کر موت تک کی سزائیں برداشت کرنا پڑیں' لیکن لوگوں کو عقیدے و روایات کی زنجیروں سے آزاد کرانا اور انہیں نئے علم و نئے نظریات سے روشناس کرانا' ایک ایسا نشہ تھا کہ جس نے ان

دانشوروں کو کمزور نہیں ہونے دیا' اور یہ انہیں کی کوششیں ہیں کہ آج بھی تہذیبی عمل برابر آگے کی جانب بڑھ رہا ہے۔ ورنہ علم کے دروازے اسی طرح سے بند رہتے' اور انسانی دماغ اسی طرح سے تنگ رہتا۔

عقل پرست دانشوروں کو اس وقت یقیناً" مشکلات کا سامنا کرنا پڑا کہ جب مضبوط اور وسیع شہنشاہتیں قائم ہوگئیں' ایک تو انہوں نے سختی و جبر کے ساتھ اپنے خلاف اٹھنے والی ہر آواز کو دبایا اور دوسرا کام یہ کیا کہ انہوں نے دانشوروں کی سرپرستی شروع کردی جس کی وجہ سے یہ سلاطین اور حکمران بہت جلد آرٹ و ادب کے سرپرست بن گئے اور دانشور ان کے درباری ملازم' دانشوروں کی سرپرستی کرنا' اور انہیں اپنے دربار میں رکھنا اور حکومتوں کی طرح ' مسلمان حکمرانوں میں بھی فیشن بن گیا' یہاں تک کہ گیارھویں صدی میں جب چھوٹی چھوٹی مسلمان حکومتیں ایران اور وسط ایشیا میں پھیلی ہوئیں تھیں تو اس وقت ہر حکمران اس کوشش میں تھا کہ اس کے دربار میں بہترین شاعر' ادبی' حکیم اور سائنس دان اور فلسفی ہوں۔ اسی لئے محمود غزنوی کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ وہ جس دانشور کی شہرت سن لیتا تھا' وہ اس کے سرپرست کو ڈرا دھمکا کر اپنے دربار میں بلا لیتا تھا' اس طرح آنے والے میں البیرونی تھا' ابن سینا کے لئے بھی محمود کا سیاسی دباؤ تھا' مگر اس نے اس جبر سے بچنے کے لئے بھاگ کر دور دراز کے علاقوں میں پناہ لی۔

ریاست کے غلام ہونے کا نقصان یہ ہوا کہ ان دانشوروں نے اپنی آزادی' اور تخلیقی صلاحیتوں کو حکمرانوں اور امراء کے لئے وقف کردیا۔ شاعر ایسے قصیدے منظوم کرنے لگے کہ جن میں اپنے سرپرستوں کی تعریف و توصیف ہوتی تھی' مورخوں نے اس قسم کی تاریخیں لکھنی شروع کردیں کہ جن میں بادشاہوں کے کارنامے ہوتے تھے' فلسفیوں نے اپنے افکار و نظریات کے ذریعہ جبر و تشدد کو جائز قرر دے دیا۔ اگرچہ معاشرہ میں ایسے بھی دانشور تھے جو دربار سے دور تھے' اور اس ماحول میں بھی اپنی بات کہتے تھے' مگر یہ دانشور یاتو خاموش رہے' یا ان کا کام خفیہ ہونے کے سبب ضائع ہوگیا'

جہاں جہاں مزاحمت کی تحریریں بچ گئی ہیں' ان سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ جبر و تشدد کے باوجود لوگ سچ بات کہنے پر تیار تھے' اور اسی لئے آج ان کا مقام درباری اور سرکاری دانشوروں کے مقابلہ میں بلند ہوگیا ہے۔

ہندوستان میں جب مسلمان خاندانوں نے اپنی حکومت قائم کی تھی' تو یہاں بھی یہی صورت حال تھی کہ دانشور ریاست کے ملازم تھے' اور چونکہ انہیں اس سے فائدہ تھا اس لئے ان کی تحریروں میں حکومت کے لئے جانبداری ہے' سوائے ان چند دانشوروں کے کہ جو دارالحکومت سے دور تھے اور وہاں وہ اشاروں' کنایوں' اور علامتوں سے اپنی مخالفت کا اظہار کرسکتے تھے۔

اس کا ایک نقصان یہ ہوا کہ جب دانشوروں نے ریاست کی امداد قبول کرلی تو اس صورت میں ان کی جانب سے کوئی مزاحمتی ادب پیدا نہیں ہوا' اور اسی لئے برصغیر میں مسلمان معاشرہ ٹھہرا اور منجمد رہا' ذہن اس قدر تنگ رہا کہ اس نے تبدیلیوں کی نشاندہی نہیں کی' اور نہ اس کا مقابلہ کرنے کا سوچا۔ یہ ایک المیہ ہے کہ برصغیر کے بڑے شاعر اور دانشور امیر خسرو بادشاہوں کے دربار میں رہ کر انہیں کے لئے لکھتے رہے' اور ذہنوں کو کھولنے کے لئے کوئی تحریر نہیں چھوڑی۔

یہی صورت حال مغل دور حکومت میں رہی' صرف اکبر کے دور میں روشن خیالی کی فضا پیدا ہوئی تھی کہ جس میں تخلیقی کام ہوئے' اور دانشوروں کو یہ موقع ملا کہ وہ تحقیق و تنقید کے ذریعہ ہر چیز کو جانچیں' مگر اس کی وفات کے بعد پھر وہی جبر و تشدد کی فضا پیدا ہوگئی' اور شاعروں اور ادیبوں' مصوروں اور مورخوں کو سونے میں تول کر' یا منہ میں موتی بھر کر خریدا جانے لگا۔

آخری عہد مغلیہ کے دانشور

آخری عہد مغلیہ میں جب مغل ریاست کے ٹکڑے ہونے شروع ہوئے اور سیاسی انتشار و ابتری پھیلی تو اس کے ساتھ ہی اس کے مالی ذرائع آمدنی بھی کم ہوگئے اور مغل دربار کی وہ شان و شوکت جو اس کے عروج کے زمانہ میں تھی گھٹ کر معمولی ہوگئی' ان حالات میں بادشاہ کے لئے یہ مشکل ہوگیا کہ وہ کم آمدنی کے ساتھ شاعروں' ادیبوں ' مورخوں اور عالموں کی سرپرستی کرسکے۔ یہی وجہ تھی کہ اب ایران سے جو دانشوروں کی آمد جاری تھی وہ بھی رک گئی' کیونکہ انہیں دربار سے کسی مالی فوائد کی توقع نہیں رہی تھی۔

لیکن اس سیاسی اور معاشی صورت حال کے کچھ مثبت نتائج بھی بر آمد ہوئے' اب تک جو دانشور بادشاہ کی سرپرستی میں دربار میں مقیم تھے اور اس کی خوشامد میں قصیدے اور تاریخیں لکھ رہے تھے' وہ مالی مجبوریوں کے سبب دربار چھوڑ کر ملازمتوں کی تلاش میں پورے ہندوستان میں بکھر گئے' دربار سے آزادی کے بعد ان کی تخلیقات بھی آزاد ہوگئیں اور ان کے لئے ضروری نہیں رہا کہ وہ اپنے سرپرست کی شان میں قصیدے لکھیں' یا تاریخ میں ان کے شاندار کارناموں کی تفصیلات گنوائیں' اس آزادی کی وجہ سے اٹھارویں صدی کے دانشوروں نے ایک زندہ اور جاندار ادب تخلیق کیا۔ اور اسی آزادی کی وجہ سے ان کے لئے یہ ممکن ہوا کہ انہوں نے اس وقت کے حکمرانوں اور حکومتی اداروں پر بھرپور تنقید کی' اور ان کے کردار کو طنز و استہزا کا نشانہ بنایا' لہٰذا اس دور کے ادب میں حکمران اپنی نالائقیوں کی وجہ سے اور امراء اپنی سستی و کاہلی و عیاشی

کی وجہ سے زوال اور پس ماندگی کے لئے مورد الزام ٹھہرائے جاتے ہیں۔

خصوصیت سے شاعروں نے ملک و معاشرہ کے انتشار و ابتری کو بڑے خوبصورت انداز میں "شہر آشوب" کی شکل میں پیش کیا۔ اور حکومتی طبقے کی بدعنوانیوں اور سازشوں کو بے نقاب کیا۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس دور کے دانشوروں کے لئے ایک مسئلہ یہ تھا کہ وہ بغیر کسی سرپرست کے اپنے وجود کو برقرار نہیں رکھ سکتے تھے' ان کے پاس نہ تو اپنے ذرائع تھے کہ جن کی بنیاد پر وہ آزادانہ طریقے سے رہ سکیں اور نہ معاشرہ میں ایسے ادارے تھے کہ جو ان کی سرپرستی کرسکیں' اس وقت تک تعلیم کی کمی کی وجہ سے اور ذرائع ابلاغ کے محدود ہونے کی وجہ سے یہ ناممکن تھا کہ وہ اپنی تحریروں اور تخلیقات کے ذریعے اپنا گذارہ کرسکیں۔ اس وقت تک تحریر کی قیمت حکمران ' راجہ ' نواب یا دولت مند اشخاص ہی چکا سکتے تھے' اس لئے یہ دانشور سرپرست کی تلاش میں برصغیر کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے چکر لگانے لگے' اس کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ اس طرح انہیں گھر یا شہر کی چار دیواری سے باہر نکلنے کا موقع ملا' اور ملک کے مختلف حصوں اور لوگوں سے مل کر ثقافتی و سماجی اختلافات کو دیکھ کر ذہن کو کشادہ کرنے کا موقع ملا۔

چونکہ سیاسی صورت حال کی وجہ سے انہیں ملازمتیں بدلنی پڑتی تھیں' اس لئے وہ کسی ایک سرپرست کے محتاج نہیں ہوتے تھے' اگر ایک ملازمت چھوڑ کر دوسری اختیار کرتے تھے تو پہلے والے سرپرست پر تنقید کرنے سے نہیں چوکتے تھے' شاعروں کے پاس ہجو کے ذریعہ انتقام لینے کا ایک ذریعہ تھا کہ جس کی پبلسٹی کرکے وہ اپنے مخالف کو بدنام کردیتے تھے۔

اس لئے اٹھارویں صدی میں جو ادب تخلیق ہوا اس میں ہندوستانی سماج کی خوبصورت انداز میں تصویر کشی کی گئی ہے۔ دانشوروں نے اس سماج کی حالت زار پر مرثیہ بھی کہے ہیں' تو طنز بھی کئے ہیں اور اپنی غزلوں' مثنویوں اور مسدسوں میں اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ بھی لیا ہے۔

لیکن اس عہد کے دانشوروں میں ایک چیز کی کمی نظر آتی ہے' کہ انہوں نے اپنے عہد سے مایوسی کا اظہار تو کیا ہے اور قائم شدہ نظام پر سخت تنقید بھی کی ہے' مگر وہ اس کا کوئی نعم البدل دینے میں ناکام رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ذہنی طور پر ان میں اتنی پختگی نہیں تھی کہ وہ تاریخ کے عمل کو پوری طرح سے سمجھ سکتے' اور یہ اندازہ لگا سکتے کہ اس کے منطقی نتائج کیا ہوں گے' اور کس طرح سے اس سیاسی زوال کو روکا جاسکے گا؟ کیا بادشاہت کے ادارے کی اصلاح کرکے؟ یا اس پورے نظام کو بدل کر اور اگر نظام کو بدلا جائے تو اس کی جگہ کون سا نظام لایا جائے؟

ان کی راہ میں سب سے بڑی دشواری یہ تھی کہ وہ دانشور ماضی کی شان و شوکت' اور سابقہ حکمرانوں کی فتوحات' انتظام سلطنت اور ان کے کارناموں سے بری طرح متاثر تھے' مثلاً" شاہ ولی اللہ ' جو اس عہد کے بڑے دانشور کہلاتے ہیں' ان کے ہاں بھی نظام میں اصلاح کے مشورے ہیں' تبدیلی کے کوئی منصوبے نہیں ہیں' حالانکہ اس وقت تک ہندوستان میں یورپی اقوام اپنے قدم جماچکی تھیں' اور ان کی موجودگی سے بہت کچھ سیکھا جاسکتا تھا۔

اس لئے اٹھارویں صدی کے یہ دانشور اپنے زمانہ کے حالات پر نوحہ کناں تو تھے' مگر ان تحریروں میں ایسا مواد نہیں ہے کہ جو عہد کو سمجھنے اور اسے تبدیل کرنا کا مشورہ دے۔ درباروں میں ملازمت کرنے کے بعد ان کی اپنی سوچ ختم ہوچکی تھی' اور وہ اس کے منتظر رہتے تھے کہ اوپر سے ہدایات آئیں اور ان کی روشنی میں وہ اپنی تخلیقات کریں۔

اس لئے دانشور ہندوستانی معاشرے کی اس اہم تاریخی موڑ پر کوئی راہنمائی نہیں کرسکے' اور نہ ہی ان چیلنجوں کا جواب دے سکے جو اس وقت معاشرہ کو درپیش تھے۔

○

سید احمد خان اور ان کے ہم عصر

ہندوستان کے وہ دانشور جو ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کے بعد ظاہر ہوئے وہ سیاسی و سماجی طور پر اپنے پیش روؤں سے زیادہ باشعور اور سمجھ دار تھے' اورانہیں اس کا پورا پورا اندازہ تھا کہ ہندوستان کا مسلمان معاشرہ مایوسی' بے چارگی اور بے حسی کا شکار ہے' اس لئے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اسے اس دلدل سے نکالا جائے۔ ان میں اعتماد کو پیدا کیا جائے اور ان کو مستقل کا راستہ دکھا کر ان کی منزل کا تعین کیا جائے۔

اس سلسلہ میں سید احمد خان کا کردار اور کام بہت اہم ہے' اول تو انہوں نے ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کو نہ صرف دیکھا جاتا بلکہ ذاتی طور پر اس المیہ سے گذرے بھی تھے' اس کے علاوہ اس تاریخی تبدیلی کو سمجھ چکے تھے جو برصغیر میں ہورہی تھی اور جس سے متاثر ہونے والے خصوصیت سے ہندوستان کے مسلمان تھے' اس لئے انہوں نے ایک منصوبہ کے تحت کام کرنا شروع کیا تاکہ مسلمانوں میں جو مذہبی تعصبات ہیں' اور جن فرسودہ روایات کو انہوں نے سینہ سے لگا رکھا ہے' ان سے انہیں چھٹکارہ دلا سکیں۔

سید احمد خان نے اس کا اندازہ لگالیا تھا کہ مسلمان معاشروں میں نہ تو اتنی ہمت ہے' اور نہ جان ہے کہ وہ مزاحمت کا راستہ اختیار کریں'اس لئے ان کے نزدیک ان کی بقاء کے لئے ضروری تھا کہ وہ انگریزوں سے مفاہمت کرکے ان کے طور طریق سیکھیں' اور جدیدیت کی راہ کو اختیار کریں' کیونکہ صرف مغربی تعلیم' اور مغرب کے نظریات کو اختیار کرکے ہی وہ پس ماندگی سے نکل سکتے ہیں۔

اس سلسلہ میں انہوں نے جو انقلابی قدم اٹھایا وہ زبان کو آسان، سہل، اور عام فہم بنانا تھا، تاکہ وہ اس قابل ہوسکے کہ اس کے ذریعہ لوگوں کی اکثریت بات کو سمجھ سکے، اور پھر اس کو اس قابل بنایا جائے کہ اس میں سائنسی اور سماجی علوم کا ذخیرہ ہوسکے اس مقصد کے لئے انہوں نے اردو کے شاعرانہ اسلوب کو ترک کرکے اب تک مفہوم کو پیچیدہ انداز میں جو کہنے کا رواج تھا اسے ختم کیا، اور اس کی جگہ کوشش کی کہ اظہار رائے سادہ انداز میں ہو۔

اردو زبان کو جدید بنانے اور اس میں نئی اصلاحات کو رواج دینے کی غرض سے انہوں نے انگریزی زبان کے بہت سے الفاظ کو استعمال کرنا شروع کیا، اگرچہ یہ ایک مشکل کام تھا، کیونکہ اردو داں طبقہ، جو عربی و فارسی سے مرعوب تھا، اور اردو کو اس شکل میں دیکھنا چاہتا تھا، ان کے لئے یہ نیا اسلوب، اور انگریزی الفاظ کا استعمال ناموس تھا، مگر اس نے ذہن کو بدلنے میں ضرور حصہ لیا، اور سید احمد خان کی کوششوں اور نئی تبدیلیوں کے بعد یہ ممکن نہیں رہا کہ سرور کی فسانہ عجائب والی زبان زیادہ عرصہ برقرار رہے، اس نے اردو زبان کے ڈھانچہ کو بدل کر رکھ دیا، اگرچہ آگے چل کر ابوالکلام آزاد نے ایک بار پھر اسے معرب بنا کر بڑا نقصان پہنچایا۔

سید احمد خان نے مسلمانوں پر بھی یہ زور دیا کہ موجودہ حالات سے نمٹنے کے لئے ضروری ہے کہ مغرب سے سائنس اور ٹیکنالوجی کو سیکھا جائے۔ اگرچہ انہوں نے اس کے ساتھ ہی اس بات پر بھی زور دیا کہ مسلمانوں کو اپنی شناخت ضرور برقرار رکھنی چاہئے، اس مقصد کے لئے انہوں نے برصغیر کی تاریخ پر چند اہم ماخذوں کی اشاعت کرائی تاکہ ان میں تاریخی شعور پیدا ہوسکے۔

سید احمد خان نے صرف تنہا ہی کام نہ کیا، بلکہ انہوں نے اپنے ہم عصر دانشوروں کو بھی متاثر کیا، اگرچہ ان دانشوروں پر تنقید کی جاسکتی ہے، مگر یہ بات تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ ان لوگوں نے معاشرے میں دانشورانہ فضا قائم کی۔ اور ان کوششوں کی وجہ سے اس بحث کا آغاز ہوا کہ قدیم روایات کو برقرار رکھنا چاہیے یا جدیدیت کی طرف

رخ کرنا چاہیے۔ اس بحث کی وجہ سے مسلمان معاشرے میں دو گروہ پیدا ہو گئے جنہوں نے اپنے اپنے نقطہ نظر کے دفاع میں دلائل دینا شروع کر دیئے۔

ان میں سے وہ لوگ کہ جو اس بات کے حامی تھے کہ بدلتے ہوئے حالات میں قدیم رویوں کو ترک کر کے جدید رجحانات کو اختیار کرنا چاہئے' ان لوگوں نے ایک طرف تو مذہبی و تاریخی شناخت کو برقرار رکھنے کی جدوجہد کی' اور یورپی دانشوروں نے جواسلام پر اعتراضات کئے تھے ان کا جواب یورپی تحقیق کے معیار پر دے کر مذہب' ثقافت اور تاریخ کو نئے سرے سے پرکھنا شروع کیا۔ ان لوگوں میں سے مولوی چراغ علی کا کام اہمیت کے قابل ہے۔ انہوں نے تحقیق اور تازہ اسلوب و دلائل کے ساتھ اسلام اور اسلامی تاریخ پر کام کیا' افسوس اس بات کا ہے کہ ان کا کام لوگوں کی نظر میں نہیں آسکا' اور یہ معاشرہ میں جو نئی تحقیق روح پھونک سکتا تھا' اور لوگوں میں جو نیا نقطہ نظر پیدا کر سکتا تھا' وہ نہیں ہوا۔

قدامت پرست دانشوروں نے ان کے مقابلہ میں قدیم روایات اور اداروں کا دفاع کیا' اور اس بات کی کوشش کی کہ مغربی حملوں کے نتیجہ میں جو ثقافتی تبدیلیاں آرہی ہیں انہیں روکا جائے۔ لیکن اس دماغ میں انہوں نے جو طریقہ استعمال کیا وہ یہ تھا کہ استدلال کی بجائے جذبات سے انہوں نے لوگوں کو متاثر کرنا چاہا' مثلاً" اکبر الہ آبادی نے جو قدامت پرستوں کے نقیب بن گئے تھے' مذاق' استہزا اور طنز کے ذریعہ سنجیدہ موضوعات پر لکھا' اور ان موضوعات کی اہمیت گھٹا کر انہیں پھکڑ بازی میں بدل دیا۔

اس لئے اگر بغور دیکھا جائے تو جدیدیت پسندوں اور قدامت پسندوں میں یہ تصادم دلیل اور جذبہ کے درمیان تھا' اور اسی لئے ان دونوں گروہوں کی زبان میں جو انہوں نے استعمال کی ہے' یہ رجحان پوری طرح سے جھلکتا ہے' جدیدیت پسند جب بھی بات کرتے ہیں تو وہ دلیل اور شواہد کی بنیاد پر اسے تسلیم کرانا چاہتے ہیں' جبکہ قدامت پسند دلائل کو چھوڑ کر لفاظی اور زبان کے ہیر پھیر کے ذریعہ اپنی سچائی کو منوانا چاہتے

ہیں۔

یہ بدقسمتی رہی کہ اس بحث کو جسے سید احمد خان اور ان کے رفقاء نے شروع کیا تھا وہ کسی منطقی نتیجہ تک نہیں پہنچی۔ برصغیر کے سیاسی حالات کی تبدیلی کے ساتھ' مسلمان دانشوروں نے یہ سمجھنا شروع کردیا کہ انگریز اور ہندو دونوں ہی ان کے دشمن ہیں۔ لہٰذا اس خطرہ اور خوف کی وجہ سے جدید تعلیم یافتہ اور قدامت پرست دونوں متحد ہوگئے اور اپنی شناخت مذہب میں ڈھونڈنے لگے۔ یہ سید احمد اور ان کے رفقاء کے نقطہ نظر سے انحراف تھا' جو کہ جدیدت کو معاشرہ کے ہر پہلو میں رائج کرنا چاہتے تھے' اس میں مذہب بھی شامل تھے' جس کو وہ جدید حالات اور اس کے تقاضوں کے تحت تبدیل کرنا چاہتے تھے۔

سید احمد خان کے بعد جو دانشور آئے انہوں نے ابتداء میں پان اسلام ازم کے نظریہ کو اختیار کرتے ہوئے امت مسلمہ کے اتحاد کے لئے کام کیا اور اس سلسلہ میں خلافت تحریک' اور ہجرت کی حمایت کی' بعد میں یہ دانشور دو حصوں میں تقسیم ہوگئے' ان میں ایک نے متحدہ ہندوستانی قومیت کا ساتھ دیا' اور دوسرے نے فرقہ وارانہ نقطہ نظر کو اختیار کرتے ہوئے دو قومی نظریہ کی حمایت کی' اور انہوں نے سیاست میں مسلم لیگ کا ساتھ دیتے ہوئے قومی ترانے' نغمے لکھنے اور مختلف پمفلٹوں اور کتابچوں کے ذریعہ اس کے منشور کو مقبول عام بنایا۔

پاکستان بننے کے بعد یہ دانشورانہ روایات تھیں جو ہمارے حصہ میں آئیں۔ اور انہیں روایات کو ہمارے دانشوروں نے آگے بڑھایا۔

○

دانشور اور نظریہ پاکستان

چونکہ پاکستان کی تحریک دو قومی نظریہ کی بنیاد پر چلائی گئی تھی' اس لئے پاکستان کی تشکیل کے بعد ریاست کی جانب سے اس بات کی کوشش کی گئی کہ اس نظریہ کا دفاع کیا جائے اور اس بات کو ثابت کیا جائے کہ پاکستان کا قیام اور اس بنیاد صحیح اور جائز تھی۔ اس مقصد کے لئے ریاست کی جانب سے دانشوروں کی خدمات حاصل کی گئیں کہ وہ اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ ریاست کی نظریاتی بنیاد کو مضبوط کریں۔

پاکستان کو نظریاتی طور پر تاریخی حیثیت دینے کی ذمہ داری سب سے زیادہ مورخوں پر آئی' چنانچہ انہوں نے جو تحقیق شروع کی اس کے تحت دو قومی نظریہ کی تاریخی حیثیت کو خوب ابھارا گیا۔ ان میں سے کچھ جوش و جذبہ میں اس قدر آگے بڑھے کہ انہوں نے برصغیر میں اس کی ابتداء محمد بن قاسم کی آمد سے کردی' اور اس بات کی کوشش کی کہ تاریخ کے مختلف ادوار میں جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان تضادات آئے ہیں ان کی نشان دہی کی جائے' چنانچہ مسلم شناخت ہماری تاریخ کا ایک اہم موضوع بن گئی جس نے تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کردیا۔ ایک طرف تو وہ تاریخی کردار تھے کہ جو مسلم شناخت اور قومیت کو ختم کرنا چاہتے تھے' اور دوسری طرف وہ قوتیں تھیں جو اس شناخت کو برقرار رکھنا چاہتی تھی۔

اس تصادم اور کشمکش کو خصوصیت کے ساتھ اکبر اور احمد سرہندی مجدد الف ثانی کی دو شخصیتوں کے ذریعہ ثابت کیا گیا ہے' چنانچہ دو قوموں نقطہ نظر سے جن افراد اور جماعتوں نے دو قومی نظریہ کی مخالفت کی' ان کا شمار دشمنوں اور غداروں میں ہوا۔ اور

جنہوں نے اس کی نشوونما' ترقی اور حفاظت میں حصہ لیا وہ ہیرو قرار پائے۔ اس لحاظ سے ہماری تاریخ کو ہیرو اور غدار کے آہنگ میں بیان کیا گیا ہے' خصوصیت کے ساتھ تحریک آزادی کی تاریخ تو اس سے بھری ہوئی ہے اور مورخوں نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ تاریخ سے ایسی مخالف قوتوں کو یا تو بالکل خارج کردیا جائے یا ان کی اس طرح سے تصویر کشی کی جائے کہ وہ پڑھنے والے کے دل میں ان کے خلاف نفرت و غصہ پیدا ہو۔

شاعروں اور ادیبوں نے اس مشن کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کے ذریعہ آگے بڑھایا چنانچہ انہوں نے نظریہ کو تقویت دینے کی غرض سے حب الوطنی کے موضوعات پر نظمیں و ترانے' نغمے اور افسانے و کہانیاں لکھیں۔ جن میں اس بات کا سبق دیا گیا کہ وطن کی خاطر جان و مال قربان کردینا چاہئے' کچھ شاعروں اور ادیبوں نے تاریخی موضوعات کو شاعری میں استعمال کیا' اور خصوصیت سے اہم تاریخی شخصیتوں کے کارناموں کو منظوم کیا ہے اور نوجوان نسل کو اس بات کی تلقین کی ہے کہ وہ ان کی تقلید کریں اور اپنی زندگیوں کو ان کے نمونوں پر ڈھالیں۔

چونکہ کسی بھی معاشرے میں دانشور ایک جیسے خیالات نہیں رکھتے ہیں' اس لئے کچھ دانشوروں نے اس بات کو محسوس کرلیا کہ پاکستان کو جن مقاصد کے لئے بنایا گیا تھا وہ پورے نہیں ہورہے ہیں' اس لئے انہوں نے دبی دبی آوازوں میں حکمران طبقے کی نا اہلی' اور عوام کے استحصال کے خلاف آوازیں اٹھائیں۔ خصوصیت کے ساتھ ایوب خان اور ضیاء الحق کے زمانہ میں دانشوروں نے آمریت اور فوج کے بڑھتے ہوئے اقتدا کے خلاف بہت کچھ لکھا۔

اس لئے حکمران طبقوں کے لئے ایسے دانشور ایک مسئلہ بن گئے لہٰذا ان کی آواز' ان کی مخالفت اور ان کے نقطہ نظر کو دبانے کے لئے دو طریقوں کو اختیار کیا گیا اول تو ایسی تحریروں کو حب الوطنی اور نظریہ کے خلاف کہا گیا اور اس مقصد کے لئے ذرائع ابلاغ عامہ کے ذریعہ یہ پروپیگنڈہ کیا گیا کہ یہ لوگ غیر ملکی ایجنٹ ہیں' ملک دشمن اور

غدار ہیں' اس لئے اگر حکومت انہیں سزا دیتی ہے' ان کی کتابوں پر پابندی لگاتی ہے' یا انہیں ملازمت سے محروم کرتی ہے تو یہ جائز قدم ہے۔

دوسرا کام یہ کیا گیا کہ اس قسم کے قوانین بنائے گئے کہ جس کی وجہ سے ان دانشوروں کے لئے یہ ناممکن ہوجائے کہ وہ حکومت کی اس' پالیسیوں اور معاشرہ میں ہونے والی نا انصافیوں پر تنقید کرسکیں۔ چنانچہ نظریہ پاکستان ' فوج اور قائد اعظم کی ذات پر تنقید کرنا قانونی طور پر جرم قرار دیا گیا۔

ان اقدامات سے چونکہ ہر حکومت کو فائدہ ہوتا ہے اس لئے کسی سیاسی جماعت اور لیڈر نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ اس نے ان دانشوروں کے لئے مسائل پیدا کردیئے کہ جو کسی مفاہمت اور سمجھوتے کے قائل نہیں ہیں اور اپنی تحریروں کے ذریعہ معاشرے کی راہنمائی کرنا چاہتے ہیں۔

ان اقدامات کے نقصان جلد ہی سامنے آگئے۔ کیونکہ ان پابندیوں کی وجہ سے آزادانہ تحقیق ناممکن ہوگئی' اس لئے ہماری یونیورسٹیاں اور تحقیقی ادارے ربڑ اسٹمپ بن کر رہ گئے' یہی وجہ ہے کہ اس عرصہ میں نہ تو نئی تحقیق ہوئی اور نہ بحث و مباحثے ہوئے اور نہ ہی تنقید کے اعلیٰ معیار پیدا ہوئے۔

اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ دانشوروں کا رشتہ لوگوں سے کٹ کر حکومت سے ہوگیا۔ جس کی وجہ سے معاشرے میں ان کی کوئی عزت نہیں رہتی وہ دانش ور کہ جو حکومت میں شامل نہیں ہوئے ان میں سے کچھ نے تو جلاوطنی اختیار کرلی' اور کچھ نے خاموشی اور چند ایسے تھے کہ جو ان تمام تکالیف کے باوجود اپنی بات کو برابر کہے گئے اور اس میں شک نہیں کہ ایسے دانشوروں کی معاشرے نے عزت کی اور انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا۔

سرکاری دانشور

پاکستان کی اس مختصر تاریخ میں سرکاری دانشوروں کا ایک طبقہ وجود میں آچکا ہے۔ ان دانشوروں کی سرکاری سرپرستی کی وجہ سے ان کے لئے ممکن ہوگیا ہے کہ وہ حکومت کے نظریات اور پالیسیوں کی حمایت کرکے انہیں عوام میں مقبول بنائیں اس مقصد کے لئے سرکاری ذرائع ابلاغ عامہ کو استعمال کیا جاتا ہے' ریڈیو اور ٹی وی دو ایسے ذرائع ہیں جن پر ان سرکاری دانشوروں کا مکمل قبضہ ہے' اس لئے جب بھی ریڈیو اور ٹی وی پر اہم موضوعات پر مباحثہ ہوتا ہے تو یہ لوگ آنکھیں بند کرکے حکومت کے اقدام کی حمایت کرتے ہیں۔ ایسے وہ تمام دانشور کہ جن کے خیالات و نظریات سے حکومت کو اختلاف ہوتا ہے انہیں سرکاری ذرائع ابلاغ سے بالکل فارغ کردیا جاتا ہے۔

ریاست کے اس نقطہ نظر کے تحت طالب علموں کے لئے سماجی علوم کی کتابیں لکھی جاتی ہیں' کہ جو انہیں محدود معلومات فراہم کرتی ہیں' اور ایک ایسا ذہن تشکیل کرتی ہیں کہ جس میں دوسرے نظریات کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔

اس لئے حکومت کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ یہ دانشور بھی اپنے خیالات بدلتے رہتے ہیں' اس کی بہترین مثال ضیاء الحق کا گیارہ سالہ دور حکومت ہے جس میں شاعروں نے حمد و نعتیں' مصوروں نے خطاطی اور افسانہ نگار و ناول نگاروں نے اصلاحی چیزیں لکھنی شروع کردیں تھیں' جس کا صلہ انہیں حکومت کی جانب سے انعامات ' اعزازات اور سرکاری تقریبات میں دعوت کی صورت میں ملا کرتا تھا' بعد میں آنے والی حکومتوں نے انہیں پلاٹ اور دوسرے مالی فوائد پہنچائے۔

دانشوروں پر مزید کنٹرول کرنے کے لئے مختلف حکومتوں نے ان کی سرکاری تنظیمیں بنوائیں، جیسے ایوب خان کے زمانہ میں رائٹرز گلڈ، صدر ضیاء الحق کے زمانہ میں اکیڈمی آف لیٹرز کو دوبارہ سے فعال بنایا گیا۔ ضیاء الحق نے تو اہل قلم کانفرسوں کے ذریعہ اہل دانش سے کافی روابط قائم کئے اور اپنے لئے ان کی حمایت حاصل کی۔

جب حکومت کی جانب سے اس قسم کی تقسیم کردی جائے کہ کون سے دانشور سرکاری ہیں، اور کون سے معتوب، تو اس صورت میں مخالف دانشوروں کے لئے بڑی مشکلات پیش آتی ہیں اول تو ان کے لئے حکومت کی ملازمت کے تمام دروازے بند کردیئے جاتے ہیں۔ اور ان کے معتوب ہونے کی وجہ سے نجی ادارے بھی ان کی خدمات حاصل کرتے ہوئے ڈرتے ہیں، اس کے بعد ہر شبہ پر انہیں گرفتار کرکے انہیں اور ان کے اہل خاندان کو اذیت دی جاتی ہے، اگر وہ بیرون ملک جانا چاہیں تو اس پر بھی پابندی عائد کردی جاتی ہے۔ ان کے معتوب ہونے کی وجہ سے نہ تو پبلشران کی کتابیں چھاپنے پر تیار ہوتے ہیں، اور نہ بک سیلر انہیں فروخت کرنے پر، بلکہ اکثرحالات میں تو دوست احباب اور رشتہ دار بھی ان سے ملنے سے پرہیز کرنے لگتے ہیں۔ اس طرح انہیں اپنے نظریات و خیالات کی ایک بھاری قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

جیسا کہ ہیگل کے بارے میں کارل پوپر نے لکھا ہے کہ ریاست کی سرپرستی کی وجہ سے پروشیا جرمنی میں تمام تعلیمی اداروں میں صرف ہیگل کے نظریات کو پڑھایا جاتا تھا کیونکہ وہ ریاست کی مضبوطی کی حمایت کرتا تھا، اس کے مقابلہ میں اس کے دوسرے ہم عصر فلسفیوں کے نظریات کی یا تو اشاعت ہی ممکن نہیں تھی اور اگر ہوتی بھی تھی تو اس کی تشہیر نہیں ہوتی تھی، ہیگل کا دیو قامت سایہ ریاست کی سرپرستی میں اس قدر چھایا ہوا تھا کہ دوسرے اس کے اندھیرے میں روپوش ہوگئے تھے۔ چنانچہ اس کا ہم عصر شوپن ہائر اس کے عہد میں تقریباً" گم نام ہی رہا۔ اس کے مرنے کے چالیس سال بعد اس کی کتاب کسی کو ردی فروش کے ہاں ملی۔ تو اس نے شوپن ہائر کو دوبارہ سے دریافت کیا۔

یہی کچھ پاکستان میں ہورہا ہے کہ اول تو ان دانشوروں کو کہ جو گذر چکے ہیں مگر جن کے خیالات ریاست کے نظریہ کو تقویت و استحکام بخشتے ہیں ان کو دوبارہ سے دریافت کرکے ان کا پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ دور جدید کے دانشوروں میں اقبال کے افکار کہ جو مطلق العنان حکومتوں کی حمایت کرتے ہیں' کیونکہ یہ جمہوری نظام کے خلاف ہیں' ان میں اشتراکیت پر تنقید' مغربی تہذیب سے بیزاری' عورتوں کی آزادی کی مخالفت' اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے ہاں شخصیت پرستی کی تبلیغ ہے' یہی وجہ ہے کہ ہر حکومت کے لئے اقبال اور ان کے افکار' کہ جو آمریت' جبر اور تشدد کی حمایت کرتے ہیں' ان کی اشاعت و تبلیغ اسی لئے کی جاتی ہے تاکہ ان سے وہ اپنے قانونی اور اخلاقی ہونے کا جواز ثابت کریں۔

مزاحمتی دانشور' سرکاری سرپرستی سے محروم ہوکر محدود ہوجاتے ہیں۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ مکمل بائیکاٹ کے نتیجہ میں انہیں فراموش کردیا جاتا ہے۔ اس صورت میں یہی امکان رہ جاتا ہے کہ وقت گذرنے کے ساتھ کبھی انہیں دوبارہ سے دریافت کیا جائے' اور پھر معاشرہ میں انہیں ان کا جائز مقام دیا جائے۔

مگر یہ ضرور ہے کہ سرکاری دانشور جو وقتی مفادات کے لئے اپنے علم و دانش کو فروخت کرتے ہیں' وہ ختم بھی وقت کے ساتھ ہوجاتے ہیں' ان کا کیریئر ان کی موت کے ساتھ ہی ختم ہوجاتا ہے' مگر مزاحمتی دانشور کی زندگی اس موت کے بعد بھی باقی رہتی ہے اور تاریخ کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔

○

دانشور اور سرپرستی

جاگیردارانہ معاشرے میں دانشوروں کے لئے آزادی کے ساتھ زندہ رہنا ناممکن ہوجاتا ہے' اسے اپنی روزی اور مالی امداد کے لئے کسی سرپرست کی ضرورت ہوتی ہے' اسی طرح غیر جمہوری حکومتوں میں اور آمریت کے دور میں جب کہ تمام ادارے حکومت کی تحویل مین آجاتے ہیں تو اس وقت بھی دانشوروں کے لئے ناممکن ہوجاتا ہے کہ وہ ان اداروں سے الگ رہ کراپنے تخلیقی کام کرسکیں۔

ہمارا دانشور مالی لحاظ سے اس قابل نہیں ہوتا ہے کہ وہ محض اپنی تحریروں اور تخلیقات کے سبب اچھی زندگی گزار سکے' اس لئے اول تو اسے اپنی روزی کے لئے جدوجہد کرنی پڑتی ہے' اور اکثر ایسی ملازمت کرنی پڑتی ہے کہ جس کا اس سے کوئی ذہنی لگاؤ نہیں ہوتا ہے۔ اور پھر جو کچھ اس کے پاس وقت بچتا ہے' اس میں وہ علمی سرگرمیوں میں حصہ لیتا ہے۔ اس صورت حال کی وجہ سے اول تو دانش ور کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا ہے کہ وہ اپنے موضوع کے بارے میں جو بھی تحقیقات ہورہی ہیں ان سے باخبر رہے' کیونکہ اس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا ہے کہ وہ کتابوں کی تلاش میں گذارے اور پھر ان کا مطالعہ کرے' اس لئے اس کے علمی کام میں گہرائی نہیں ہوتی ہے' اور تحقیقی کام میں جس پختگی کی ضرورت ہے وہ حاصل نہیں ہوپاتی۔ دوسرے اگر وہ ان تمام مشکلات پر قابو پائے' کتابوں کو تلاش کرے' ان کا مطالعہ کرے' اور اپنی تحقیق کرے تو اس صورت میں اسے کافی وقت درکار ہوتا ہے۔ اور وہ پوری زندگی میں چند تخلیقات ہی پیش کرسکتا ہے۔ جس کی وجہ سے معاشرہ اس کی صلاحیتوں سے پورا

فائدہ نہیں اٹھاتا ہے۔

ہمارے ہاں جو دانشور یونیورسٹیوں اور تحقیقاتی اداروں میں ہیں' انہیں یہ مواقع حاصل ہیں کہ وہ کل وقتی دانشور کی حیثیت سے عمدہ تخلیقی کام پیش کرسکتے ہیں' مگر ان سہولتوں کے باوجود پاکستان کی تاریخ میں یونیورسٹیوں اور تحقیقاتی اداروں نے چند ہی دانشوروں کو پیدا کیا ہے کہ جنہوں نے معاشرہ میں کچھ شعور پیدا کیا ہو۔

اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لئے کہ ایسا کیوں نہیں ہوا؟ تو اس میں پھر نظریہ ایک ایسی رکاوٹ بن کر پیش آتا ہے کہ جس نے دانشوروں کے ذہنوں پر پہرہ بٹھا دیا ہے اس کی ایک مثال تاریخ کی تحقیق ہے' پاکستان میں تاریخ کا ایک سرکاری نقطہ نظر مسلسل ذرائع ابلاغ و نصاب کے ذریعہ پیش کیا جارہا ہے' اب حکومت کے ادارے جو بھی کام کرتے ہیں ان سے یہی کہا جاتا ہے کہ وہ حکومت کے پیش کردہ نظریہ کی حمایت کریں۔ چنانچہ ہماری یونیورسٹیوں میں تحقیق کے وہ موضوع اختیار کئے جاتے ہیں کہ جو پاکستان کی تحریک اور دو قومی نظریہ کی حمایت کرتے ہیں۔ ان ہی موضوعات پر تحقیقی وظائف ملتے ہیں۔ انہیں کتابوں پر انعامات ملتے ہیں' اور انہیں کی بنیاد پر لوگوں کو ترقی ملتی ہے۔

اس کے علاوہ اس عرصہ میں ریاستی ذرائع ابلاغ نے ہمارے قومی راہنماؤں کی جو تصویر لوگوں کے ذہن میں بٹھا دی ہے' اگر کوئی تحقیق کے ذریعہ اس سے مختلف بات کہے گا تو اس تحقیق پر فوراً" پابندی لگا دی جائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ وو لپرٹ کی کتاب جو جناح صاحب پر ہے' پاکستان میں پابندی لگا دی تھی۔ چونکہ پاکستان میں ایک ایسا قانون ہے کہ کوئی بھی بات ایسی نہ کہی جائے کہ جو بانی پاکستان کے خلاف ہو' اس لئے محقق کے لئے ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ حکومت کے بنائے ہوئے فریم ورک میں تحقیق کرے' مگر ظاہر ہے کہ اس تحقیق کو پاکستان میں سرکاری طور پر تو پذیرائی مل سکتی ہے مگر پاکستان سے باہر اس کی کوئی قدر نہیں ہوتی ہے۔

ایک طرف تو نظریہ پاکستان دانشوروں کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے' تو دوسری طرف

مذہب اور تہذیبی رویوں اور اقدار کو لے کر ہم سماجی علوم میں تحقیق کو روکتے ہیں' مثلاً" اردو سائنس بورڈ نے "اطلاقی نفسیات" پر جسے حمید ہاشمی اور دوسرے ماہر نفسیات نے لکھا ہے' اس لئے چھاپنے سے انکار کردیا تھا کہ اس میں فحاشی ہے اور بعض باتیں ہماری تہذیبی اقدار کے خلاف ہیں۔

لہٰذا ایسے تمام موضوعات کہ جو ہمارے معاشرہ کی خرابیوں سے پردہ اٹھاتے ہیں یا جوریاست و حکومت اور حکمران طبقوں کے کردار کا جائزہ لیتے ہیں ان پر حکومتی اداروں میں تحقیق کرنے کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔

ان حالات میں دانشور خود کو پھر اسی حالت میں پاتے ہیں کہ جس میں وہ بادشاہوں کے زمانہ میں تھے کہ جہاں انہیں حکمرانوں کی خوشامد کرکے گذارہ کرنا پڑتا تھا' اور آج بھی یہی صورت ہے کہ دانش ور ان اداروں میں درباری کی طرح ہے جو ان کی خوشنودی کی خاطر تحقیق کر رہا ہے' کیونکہ اسے ڈر ہے کہ اگر اس نے ان کی مخالفت کی تو اسے ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑیں گے' اور اسے یہ بھی احساس ہے کہ وہ بغیر حکومت کی سرپرستی کے زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔

اس کے برعکس صنعتی معاشرے میں دانشوروں کو اس بات کے پورے مواقع ملتے ہیں کہ وہ آزادانہ طور پر اپنے نظریات اور نقطہ نظر کو پیش کرسکیں' اس کی وجہ یہ ہے کہ صنعتی معاشرہ تبدیلی کے عمل سے دوچار رہتا ہے جس کے ساتھ ساتھ معاشرتی و تہذیبی رویہ اور اقدار بھی بدلتی رہتی ہیں' اس لئے تبدیلی کے عمل کا تجزیہ کرنے کے لئے دانشوروں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے' اور معاشرہ مسائل کی تخصیص اور حل کے لئے ان کی طرف دیکھتا ہے' چنانچہ ان کی تحقیق کے لئے وسائل فراہم کرنے کی غرض سے سرکاری اور نجی ادارے یا فاؤنڈیشنز ہوتی ہیں جو دانشوروں کو مختلف موضوعات پر کام کرنے کی غرض سے وظائف اور مالی امداد دیتی ہیں جس کی وجہ سے ان کے لئے یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ وہ گہرائی کے ساتھ اپنے موضوع پر تحقیق کرسکیں۔

مزید یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں میں تحقیق کی ہمت افزائی کی جاتی ہے' اور پھر

مذہب اور تہذیبی رویوں اور اقدار کو لے کر ہم سماجی علوم میں تحقیق کو روکتے ہیں' مثلاً" اردو سائنس بورڈ نے "اطلاقی نفسیات" پر جسے حمید ہاشمی اور دوسرے ماہر نفسیات نے لکھا ہے' اس لئے چھاپنے سے انکار کردیا تھا کہ اس میں فحاشی ہے اور بعض باتیں ہماری تہذیبی اقدار کے خلاف ہیں۔

لہٰذا ایسے تمام موضوعات کہ جو ہمارے معاشرہ کی خرابیوں سے پردہ اٹھاتے ہیں یا جوریاست و حکومت اور حکمران طبقوں کے کردار کا جائزہ لیتے ہیں ان پر حکومتی اداروں میں تحقیق کرنے کی اجازت نہیں ہوتی ہے۔

ان حالات میں دانشور خود کو پھر اسی حالت میں پاتے ہیں کہ جس میں وہ بادشاہوں کے زمانہ میں تھے کہ جہاں انہیں حکمرانوں کی خوشامد کرکے گذارہ کرنا پڑتا تھا' اور آج بھی یہی صورت ہے کہ دانش ور ان اداروں میں درباری کی طرح ہے جو ان کی خوشنودی کی خاطر تحقیق کر رہا ہے' کیونکہ اسے ڈر ہے کہ اگر اس نے ان کی مخالفت کی تو اسے ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑیں گے' اور اسے یہ بھی احساس ہے کہ وہ بغیر حکومت کی سرپرستی کے زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔

اس کے برعکس صنعتی معاشرے میں دانشوروں کو اس بات کے پورے مواقع ملتے ہیں کہ وہ آزادانہ طور پر اپنے نظریات اور نقطہ نظر کو پیش کرسکیں' اس کی وجہ یہ ہے کہ صنعتی معاشرہ تبدیلی کے عمل سے دوچار رہتا ہے جس کے ساتھ ساتھ معاشرتی و تہذیبی رویہ اور اقدار بھی بدلتی رہتی ہیں' اس لئے تبدیلی کے عمل کا تجزیہ کرنے کے لئے دانشوروں کی اہمیت بڑھ جاتی ہے' اور معاشرہ مسائل کی تخصیص اور حل کے لئے ان کی طرف دیکھتا ہے' چنانچہ ان کی تحقیق کے لئے وسائل فراہم کرنے کی غرض سے سرکاری اور نجی ادارے یا فاؤنڈیشنز ہوتی ہیں جو دانشوروں کو مختلف موضوعات پر کام کرنے کی غرض سے وظائف اور مالی امداد دیتی ہیں جس کی وجہ سے ان کے لئے یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ وہ گہرائی کے ساتھ اپنے موضوع پر تحقیق کرسکیں۔

مزید یونیورسٹیوں اور تعلیمی اداروں میں تحقیق کی ہمت افزائی کی جاتی ہے' اور پھر

ان کی تحقیقاتی نتائج کی اشاعت کے لئے علمی جرنل' رسالے اور اخبارات ہوتے ہیں' جہاں ان نتائج پر تنقید کی جاتی ہے اور بحث و مباحث کا ایک سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔

دانشوروں کی اہمیت کے پیش نظر مغرب اور امریکہ کی حکومتیں ان کو ملکی و غیر ملکی امور ماہرین مقررہ کرتی ہیں' دوسری طرف ان کی تحریروں کے ذریعہ معاشرہ میں لوگوں کی رائے کو کسی مسئلہ پر یا تو ہموار کیا جاتا ہے یا مخالفت کی جاتی ہے چنانچہ ۱۹۶۰ء کی دھائی میں طالب علموں کی بغاوت اور ویت نام کی جنگ میں یورپی اور امریکی دانشوروں نے ذہن کو بنانے میں حصہ لیا۔ الجزائر کی جنگ آزادی کے دوران فرانسیسی دانشوروں نے فرانس کی مخالفت کی۔ اور اس کے مقابلہ میں الجزائر کا ساتھ دیا۔ لیکن اس کی وجہ سے انہیں نہ تو ملک دشمن کہا گیا اور نہ غیر ملکی ایجنٹ۔

پاکستان کا دانشور یہ رول ادا کرنے سے اس لئے مجبور ہے کہ وہ مالی طور پر آزاد نہیں ہے اور اپنی روزی قلم سے نہیں کماتا ہے۔ لکھنا اس کا جزوقتی پیشہ ہے کیونکہ کل وقتی دانشور بننے کے لئے اس کے پاس وسائل نہیں ہیں۔

دانشور اور مالی وسائل

صنعتی ملکوں میں دانشوروں کے لئے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ مالی لحاظ سے فارغ البال ہوجائیں' اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں شرح خواندگی زیادہ ہے' لوگوں میں پڑھنے کا رواج ہے۔ اس لئے اخبارات' رسائل اور کتابوں کی مانگ بہت ہوتی ہے اس لئے وہاں پبلشروں کے لئے یہ لازمی ہوتا ہے کہ اچھے مصنفین کی کتابیں زیادہ قیمت پر حاصل کرکے انہیں چھاپیں جیسے جیسے ایک مصنف کی شہرت ہوتی جاتی ہے اسی طرح سے اس کی رائلٹی کا نرخ بھی بڑھتا جاتا ہے۔ اور کیونکہ اکثر کتابیں لاکھوں کی تعداد میں چھپتی ہیں اس لئے ایک کتاب کی اشاعت کے بعد ہی بعض لکھنے والے مالی دشواریوں سے آزاد ہوجاتے ہیں۔ مثلاً" ول ڈیورانٹ کی پہلی کتاب "فلسفہ تاریخ" اس قدر مقبول ہوئی اور اسے اس کتاب سے اس قدر آمدنی ہوئی کہ اس نے ملازمت چھوڑ کر کل وقتی طور پر لکھنے کو اپنا پیشہ بنالیا اور "تہذیب کی تاریخ" کے عنوان سے ۱۱ جلدوں میں تاریخ لکھ ڈالی۔

اس طرح اخبارات اور رسائل میں مصنفوں کو اس قدر معاوضہ مل جاتا ہے کہ وہ مالی طور پر آزاد ہوجاتے ہیں اور ان کے لئے یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ وہ اپنا تمام وقت علمی سرگرمیوں میں گزار دیں۔ اس کے علاوہ علمی و ادبی کاموں پر انعامات کا سلسلہ ہے اور جس کو یہ انعام مل جاتا ہے اسے شہرت کے ساتھ ساتھ مالی طور پر بھی فائدہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ دانشور ملکی و غیر ملکی معاملات میں حصہ لیتے ہیں' اور اپنے معاشرہ کی کمزوریوں سے پردہ اٹھاتے ہیں۔ اور حکومت کی پالیسیوں پر کڑی تنقید کرتے

ہیں اگرچہ یہاں بھی وہ دانشور ہوتے ہیں جو قدامت پرستی کے حامی ہوتے ہیں' مگر ان کا یہ نقطہ نظر کسی دباؤ اور مجبوری کے تحت نہیں ہوتا' یہ ان کے ذہنی تصور کی پیداوار ہوتا ہے اس لئے یہاں پر منافقت کی گنجائش کم ہوجاتی ہے۔

اس کے برعکس پاکستان کے دانشوروں کے لئے قلم سے روزی کمانا' یا مالی طور پر استحکام حاصل کرنا انتہائی مشکل کام ہوتا ہے کیونکہ اول تو معاشرہ میں شرح خواندگی بہت کم ہے' اور پھر جو لوگ پڑھنا چاہتے ہیں ان کے لئے مہنگائی کے زمانہ میں کتاب خریدنا مشکل ہوجاتا ہے اس وجہ سے ہمارے پاس کتاب چھپنے کی تعداد ایک ہزار سے پانچ سو تک ہے مگر اکثر اس کی رائلٹی بھی مصنف کو نہیں ملتی ہے۔ کیونکہ پبلشنگ کا کاروبار کرنے والے بے انتہا بددیانت اور بے ایمان ہیں' ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ رائلٹی دینے کی بجائے یہ الٹا مصنف سے پیسے لے لیں۔ اگر کوئی منصف مشہور ہے اور اس کی کتابیں فروخت ہوتی ہیں تو یہ اطمینان سے اسے بتائے بغیر دوسرا یا تیسرا ایڈیشن بھی چھاپتے رہتے ہیں۔ چنانچہ پبلشر حضرات تو مالی طور پر ترقی کررہے ہوتے ہیں جبکہ مصنف بھوکوں مررہے ہوتے ہیں۔

اور کچھ اسی قسم کی پالیسی اخبارات و رسائل کی ہے' اردو کے اخبارات میں تو لکھنے والے کو معاوضہ دینے کا رواج نہیں ہے' اور اگر کچھ مستقل لکھنے والوں کو دیا بھی جاتا ہے تو وہ برائے نام ہوتا ہے۔ انگریزی کے کچھ اخباروں میں لکھنے والوں کو مناسب معاوضہ دیا جاتا ہے مگر اکثر اخبارات کے مالکین کی ذہنیت یہی ہوتی ہے کہ بغیر معاوضہ کے کام چل جائے تو اچھا ہے اس لئے کسی بھی دانشور کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اخبارات اور رسائل میں لکھ کر مالی طور پر ان پر مکمل انحصار کرے۔

معاشرے میں دانشور کی عزت و احترام اس لئے گھٹ جاتا ہے کہ وہ مالی طور پر خوش حال نہیں ہوتا ہے۔ اس کے پاس امارت کے ٹھاٹ باٹ نہیں ہوتے ہیں۔ اور نہ وہ اس قابل ہوتا ہے کہ دعوتوں کے ذریعہ دوستوں کو خوش کرسکے' اس لئے ہمارے معاشرے میں کہ جہاں دولت اور طاقت کے ذریعہ افراد کی عزت کی جاتی ہے اور ان کا

سماجی رتبہ متعین کیا جاتا ہے' اس میں دانشور نہیں آتا ہے' اور اسے ناکارہ سمجھ کر اس پر رحم تو کیا جاتا ہے' مگر عزت نہیں کی جاتی ہے۔

اس کی عزت اس وجہ سے بھی نہیں ہوتی ہے کہ اس کی تحریروں کو پڑھنے والے ہی بہت کم ہوتے ہیں' اور ذہنی طور پر لوگ اس قدر پسماندہ ہوتے ہیں کہ وہ اکثر نئے خیالات کی گہرائی سمجھنے کے اہل نہیں ہیں۔ اس لئے دانشور ان کے لئے ایک بند کتاب کی مانند ہوتا ہے کہ جسے دولت کمانے والا معاشرہ ناکارہ اور نا اہل سمجھتا ہے۔

اس کے علاوہ پاکستان کے لکھنے والے زبان کے حساب سے دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں' ایک وہ جو انگریزی میں لکھتے ہیں اور وہ دوسرے جو اردو اور صوبائی زبانوں میں لکھتے ہیں۔ انگریزی لکھنے والوں کا معیار علمی و ادبی لحاظ سے بلند ہوتا ہے مگر ان کے پڑھنے والوں کی تعداد بڑی محدود ہوتی ہے۔ اس لئے ان میں سے اکثر کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ ان کی کتابوں اور تحریروں کو بین الاقوامی شہرت مل جائے' جب ان کے ذہن میں یہ ہوتا ہے تو اکثر وہ اپنے لوگوں کو مخاطب کرنے کی بجائے باہر کے لوگوں کے ذہن کو سامنے رکھتے ہیں۔ اگر کسی کی کتاب یورپ اور امریکہ میں چھپ جاتی ہے تو اس کی شہرت پاکستان میں بھی زیادہ ہوجاتی ہے۔

ایک جمہوری اور صنعتی معاشرے میں دانش ور کا کردار بھی بدل جاتا ہے یہ اس کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ تبدیل ہوتے ہوئے معاشرے کی ضرورت اور رجحانات کی نمائندگی کرے اور لوگوں میں ان کا شعور پیدا کرے تاکہ وہ خود کو اس تبدیلی کے عمل میں شامل کرکے' نئے حالات میں خود کو ضم کرسکیں۔ لہٰذا اس غرض سے سرکاری' نیم سرکاری اور غیر سرکاری تحقیقی ادارے قائم کئے جاتے ہیں تاکہ دانشوروں کو آزادانہ طور پر مالی وسائل کی پریشانیوں سے بے فکر ہوکر کام کرنے کے مواقع مل جائیں۔ ان اداروں کے علاوہ یونیورسٹیوں میں تحقیق کے کام کے لئے مخصوص فنڈ ہوتے ہیں جو دانشوروں کو مواد اکٹھا کرنے' سفر کرنے اور لوگوں سے ملنے کے مواقع فراہم کرتے ہیں۔ ان سہولتوں کی وجہ سے وہاں پر ہر مضمون میں دانشور اپنی تحقیق کے نتیجہ میں

لکھے ہوئے مقالات کو جرنلز اور کتابوں میں چھپواتے ہیں' اور اس کے بعد ان کے اخذ کئے ہوئے نتائج اور نظریات کے اوپر بحث و مباحثہ اور تنقید کا سلسلہ شروع ہوتا ہے اس کا ایک فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ محقق جب بھی کوئی چیز چھپواتا ہے تو وہ بڑا محتاط ہوتا ہے کیونکہ اسے پتہ ہوتا ہے کہ اس کی ذرا سی غلطی کو پکڑ لیا جائے گا جس سے اس کی عزت پر حرف آئے گا۔ اس لئے وہ اپنے مسودہ کو نہ صرف خود بار بار لکھتا ہے' بلکہ اپنے ساتھیوں اور مضمون کے ماہرین سے اس پر شائع ہونے سے پہلے رائے لیتا ہے۔ اور ان کے مشوروں سے اس میں ترمیم و اضافے کرتا ہے۔ اس لئے مغرب میں تحقیق کے کام میں احتیاط اور جامعیت انتہائی اہم ہوگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہاں کی دانشوری کی دنیا میں نئے نئے خیالات و افکار پیدا ہوتے ہیں۔ ان پر بحث ہوتی ہے' تنقید ہوتی ہے' اور ہر پہلو سے انہیں پرکھا جاتا ہے' اور پھر یا تو ان کی قبولیت مل جاتی ہے اور یا انہیں رد کردیا جاتا ہے۔

چونکہ ان معاشروں میں دانشوروں اور ان کے نظریات کی ضرورت ہے' اور ان کی تحقیق کی روشنی میں وہ اپنے سیاسی و سماجی اور معاشی منصوبے بناتے اور ان پر عمل کرتے ہیں' اپنی خارجہ پالیسی میں ان سے مدد لیتے ہیں' اور کسی بھی بحران کی صورت میں بھی ان سے مشورہ کرتے ہی' اس لئے معاشرہ میں دانشور کی حیثیت انتہائی اہم اور اونچی ہوجاتی ہے' ان کی عزت و احترام کیا جاتا ہے ' وہ معاشرہ کا ضمیر ہوتے ہیں' اور ان کی رائے و مشورہ میں معاشرہ کا مفاد ہوتا ہے۔

مثلاً" اس کی ایک مثال ۱۹۶۰ء کی دھائی میں یورپ اور امریکہ میں طالب علموں کی بغاوت میں دانشوروں کا حصہ ہے' جس نے نہ صرف یورپ و امریکہ کے معاشروں میں سیاسی ہیجان پیدا کیا بلکہ ان کے تعلیمی ادارں کو بھی بدل کر رکھ دیا۔ اسی طرح مسئلہ الجزائر پر فرانس کے مشہور دانشوروں نے اپنی حکومت کی مخالفت کی اور اس سے مطالبہ کیا کہ وہ اس کی آزادی کو تسلیم کرے۔ اس موقع پر جب کہ فرانس کا معاشرہ قومیت کے جذبات سے مشتعل ہورہا تھا' اور الجزائر کی آزادی کو اپنی شکست سمجھتا تھا'

ان دانشوروں نے عوامی جذبات سے علیحدہ ہٹ کر اپنے خیالات کا اظہار کیا' جن لوگوں نے اس وقت ان دانشوروں کو فرانس کا دشمن اور غیر ملکی ایجنٹ کہا تھا' آج ان کا تو کوئی نام و نشان نہیں ہاں یہ دانشور اب تک اپنی سچائی کی وجہ سے تاریخ میں زندہ ہیں۔ یہ ایک مشہور بات ہے کہ جب ڈیگال' جو کہ اس وقت فرانس کا صدر تھا پر زور دیا گیا کہ وہ ژاں پال سارترے کو جنگ کی مخالفت کی بناء پر گرفتار کرے' تو اس نے جواب دیا۔ سارترے فرانس ہے اور میں فرانس کو کیسے گرفتار کرسکتا ہوں۔

ان واقعات کو ذہن میں رکھتے ہوئے' جب ہم یہ سوال خود سے پوچھتے ہیں کہ کیا پاکستانی دانشور اس قسم کا کردار ادا کرسکتے ہیں؟ تو اس کا جواب نفی میں دیا جاسکتا ہے کیونکہ اب تک کی جو شہادتیں ہمارے پاس ہیں' ان سے یہ صاف واضح ہوگیا ہے کہ پاکستانی دانشوروں کی اکثریت نے ہمیشہ حکمران طبقوں کے مفادات کی حمایت کی ہے۔ مثلاً" جنگ کے موقعہ پر بجائے اس کے کہ یہ اس کی مخالفت کرتے اور جنگ کی ہولناکیوں سے لوگوں کو آگاہ کرتے' ہمارے دانشوروں نے اس کی بجائے عوام کے جذبات کو اپنی شاعری اور افسانوں کے ذریعہ بھڑکایا اور امن کی بجائے جنگ کی جانب مائل کیا۔ اس لئے اس رویہ سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے دانشوروں نے آخر کیوں موقع پرستی اور خوشامدی کو اختیار کیا؟ آخر انہوں نے کیوں اتھارٹی کو چیلنج نہیں کیا اس پر تنقید نہیں کی اور اس کے خلاف کوئی بغاوت کی آواز نہیں اٹھائی؟

اس کے پس منظر میں جو معاشی و سماجی حالات ہیں وہ یہ کہ ہمارا دانشور جاگیردارانہ اقدار اور روایات کو تسلیم کرتے ہوئے اس بات کا خواہش مند ہوتا ہے کہ اسے کوئی فیاض سرپرست مل جائے کہ وہ اسے مالی پریشانیوں سے آزاد کردے' اس معاشی تحفظ کے لئے وہ اپنے فن کو قربانی کرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ کیونکہ اتھارٹی اسے سرپرستی اور تحفظ دیتی ہے اس لئے وہ اس کی خوشنودی کے لئے سرگرداں رہتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں کیونکہ ہمارا معاشرہ ان پڑھ ہے اور اس کے پاس اتنے معاشی ذرائع نہیں ہیں کہ وہ ریاست کی اتھارٹی کے مقابلہ میں دانشور کو زیادہ دے سکے' اس لئے دانشور ان

سے منہ موڑ کر ریاست کی سرپرستی کے حصول کے لئے متوجہ ہوجاتا ہے' اور یہی وجہ ہے کہ وہ ریاست سے انعامات و اکرامات اور خطابات کی زیادہ سے زیادہ توقع کرتا ہے اور اپنی تحریروں کو بدلتی ہوئی حکومتی پالیسیوں کے تحت تبدیل کرتا رہتا ہے۔

ہمارے دانشوروں کا یہ کردار اس وقت پوری طرح سے کھل کر آگیا کہ جب ملک میں مارشل لاء لگا اور یہاں پر یکے بعد دیگرے آمرانہ حکومتیں قائم ہوئیں' ان حالات میں دانشوروں نے عوام کا ساتھ دینے کی بجائے آمروں اور فوجی حکومتوں کا ساتھ دیتے ہوئے ان کی تعریفیں کیں۔ مثلاً" جب ایوب خان کی کتاب "فرینڈز ناٹ ماسٹرز" شائع ہوئی تو دانشوروں نے اس کے سیاسی' ادبی' فلسفیانہ اور تاریخی پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور اس کی بے انتہاء تعریفیں کیں جب ایوب خان کی حکومت کا جشن دہ سالہ منایا گیا تو اس کی برکتوں اور اچھائیوں پر لاتعداد مقالے اور نظمیں لکھی گئیں حالانکہ یہی جشن اس کی حکومت کا زوال ثابت ہوا اور ایوب خان کی حکومت کے خاتمہ کے ساتھ ہی اس کی حکومت کے بارے میں سارے تجزیئے غلط ثابت ہوئے۔

دانشوروں کے اس رویہ کی وجہ سے معاشرہ میں ان کی کوئی عزت نہیں رہ جاتی ہے' اور نہ ہی اس کی تحریروں میں کوئی جان رہتی ہے ' وہ سرپرستی کی خاطر ایک کے بعد ایک کرکے ہر آنے والی حکومت کی خوشامد میں مصروف رہتا ہے اور اس طرح اندر سے کھوکھلا ہوتا چلا جاتا ہے۔

○

بیوروکریٹ دانش ور

ہمارے دانشوروں میں سے ایک قسم کے دانشور بیوروکریٹ اور انتظامیہ کے اعلیٰ افسر ہیں، ان میں شاعر، ادیب اور محقق سب ہی شامل ہوتے ہیں، انتظامیہ میں ہونے کی وجہ سے اور اعلیٰ اختیارات رکھنے کی وجہ سے ان کی معاشرہ میں ویسے ہی عزت و احترام ہوتا ہے، اور جب یہ دانش ور بھی بن جائیں تو ان کی عزت میں اور زیادہ اضافہ ہوجاتا ہے، ان کی تخلیقات فوراً اخباروں اور رسالوں میں نمایاں جگہ پر شائع ہوتی ہیں، اور سارے نقاد ان کی تعریف میں رطب اللسان ہوجاتے ہیں ہر مشہور پبلشر ان کی کتابیں چھاپنے پر تیار ہوجاتا ہے، اور کتابیں چھپنے کے بعد ان کے شعبہ کے لوگ اور دوسرے افسران ان کو خریدنے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔

بحیثیت دانشور ان کا مقام فوراً معاشرہ میں تسلیم کرلیا جاتا ہے۔ اور یہ جلسوں کی صدارت اور ادبی تقریبات میں چیف گیسٹ کی حیثیت سے مدعو کئے جاتے ہیں۔ اس کا ایک نتیجہ تو یہ ہوتا ہے کہ ان کی بے جا تعریف اور شہرت کی وجہ سے حقیقی دانشوروں کی جڑیں خشک ہوجاتی ہیں اور وہ دانشور کہ جو حالات سے سمجھوتہ نہیں کرتے ہیں، ان کو بالکل نظرانداز کردیا جاتا ہے۔

بیوروکریٹ دانشوروں کا ایک کام یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح سے تاریخ کو مسخ کریں اور اپنے اور اپنے سرپرستوں اور ریاستی پالیسیوں کو کس طرح سے جائز ثابت کریں، اس کی دو مثالیں ہمارے سامنے ہیں، قدرت اللہ شہاب جو بحیثیت افسانہ نگار کے کوئی زیادہ اعلیٰ افسانہ نگار نہیں تھے۔ مگر جب تک وہ افسر رہے، انہیں اردو ادب کا

بڑا افسانہ نگار مانا جاتا رہا' انہوں نے آخر میں "شہاب نامہ" کے عنوان سے اپنی سوانح لکھی اور کوشش کی کہ وہ اپنا مقام تاریخ میں بلند کرجائیں۔ اول تو انہوں نے اس بات کا دعویٰ کیا کہ بحیثیت انڈین افسر کے انہوں نے پاکستان کا ساتھ دیا۔ اور خفیہ طور پر معلومات مسلم لیگ کے راہنماؤں تک پہنچائیں۔ اس طرح سے انہوں نے خود کو تحریک پاکستان کے سرگرم کارکنوں میں شامل کرلیا۔

ایوب خان کی آمریت کے زمانہ میں انہوں نے جو کارنامے سرانجام دیئے ان میں سے ایک پروگریسوز پیپرز کو حکومتی سرپرستی میں دینے کا تھا' اس میں انہوں نے سرگرمی سے حصہ لیا۔ مگر اسی کتاب میں ان کے وہ ارشادات بھی ہیں کہ جو انہوں نے ایوب خان کو جمہوریت کی بحالی کے لئے دیئے تھے۔ اس لئے ان کی وہ حیثیت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ جس نے ایک جابر حکمران کے سامنے کلمہ حق بلند کیا۔ اور آخر میں شہاب صاحب صوفی بزرگ بن جاتے ہیں کہ جن پر پوشیدہ رازوں کا انکشاف ہورہا تھا۔

اس طرح الطاف گوہر نے ایوب خان پر کتاب لکھ کر اس بات کی کوشش کی ہے کہ انہوں نے بحیثیت افسر کے جو وقت ایک آمر کی خدمت میں گزارا ہے اس کا کوئی جواز پیش کیا جائے۔ اس میں انہوں نے یہ کوشش کی ہے کہ ایوب خان کی تاریخ لکھتے ہوئے اس کی داخلی پالیسی اور معاشرہ پر آمریت کے اثرات کو بالکل نظرانداز کرکے اس کی خارجہ پالیسی پر زور دیا ہے کہ جس میں ایوب خان قدر آور شخصیت کی حیثیت سے ابھر کے آتے ہیں۔ اس پوری کتاب میں بڑی خوبصورتی سے تاریخ کو مسخ کیا گیا ہے اور واقعات کو اس طرح سے بیان کیا گیا ہے کہ اس سے نہ صرف ایوب خان تمام الزامات سے بری ہوجاتے ہیں بلکہ الطاف گوہر کے گناہ بھی اس کے ساتھ ہی دھل جاتے ہیں سونے پر سہاگہ یہ کہ اس میں ایوب اور الطاف گوہر دونوں مظلوم ہیں' ظالم معاشرہ اور سازشی گروہ ہیں۔

ایک اور مثال دوسرے بیوروکریٹ دانشور ایس اکبر احمد کی ہے.کہ جنہوں نے ضیاء الحق کے دور میں "پاکستانی معاشرہ" کتاب میں ایک مقالہ "آرائیوں" پر لکھا ہے'

خیال ہے کہ ضیاء الحق خود بھی آرائیں تھے۔ اس میں اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آرائیوں میں جو دیانت داری محنت و لگن سے کام کرنے کا جذبہ ہوتا ہے وہی انہیں آگے بڑھاتا ہے اور پاکستان کی تاریخ میں ضیاء الحق سمیت بڑے لوگ آرائیں ہیں، جو اس برادری کی خصوصیات کی وجہ سے ہیں، بدقسمتی سے ان دانشوروں کے بہت سے دعویٰ اس لئے باقی رہ جاتے ہیں کہ کوئی ان پر تنقید نہیں کرتا ہے اور نہ ہی انہیں چیلنج کرتا ہے۔

○

دانشور بننے کا شوق

دانشور کا معاشرہ میں جو مقام ہوتا ہے' اس کے پیش نظر اکثر لوگوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ بھی دانشور بن جائیں اور اس حیثیت سے معاشرہ میں ایک ممتاز مقام حاصل کرلیں۔ اس سلسلہ میں مشکل اس وقت پیش آتی ہے کہ جب ان خواہش مند لوگوں میں کوئی دانشورانہ صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔ لہٰذا پھر ان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ کسی ایسے دانشور کی خدمات حاصل کرلیں کہ جو اپنی تخلیقات فروخت کرنے کے لئے تیار ہو' لہٰذا تخلیق خریدنے کا کام وہی کرسکتا ہے کہ جس کے کافی مالی وسائل ہوں۔ اور جو اپنے پیسہ کے زور پر دانشوروں کو اپنا ملازم رکھ سکے' لیکن پیسہ کے ساتھ ساتھ دوسری چیز جو کسی شخص کو دوسرے کی تخلیقات حاصل کرنے کا موقع فراہم کرتی ہے وہ اس کے اختیارات ہیں۔ اگرچہ اس کے علاوہ بھی دوسری وجوہات ہوتی ہیں کہ جو غیر دانشوروں کو دانش ور بناتی ہیں۔ مثلاً" ایک زمانہ تھا کہ جب اردو میں شاعری مقبول عام صنف تھی اور مشاعرے اس کے اظہار کا ذریعہ تھے' لہٰذا ان مشاعروں میں کامیابی سے غزل پڑھنا اور سامعین سے داد و تحسین وصول کرنا عزت و وقار کی بات تھی' اس لئے اساتذہ کے لئے ضروری تھا کہ مشاعرے میں ان کے شاگردوں کی بڑی تعداد موجود رہے تاکہ وہ ان کی تعریف کرسکیں اور ان کے مخالف اور رقیب اساتذہ کو ہوٹ کریں لہٰذا ہر استاد شاگردوں کی تعداد بڑھانے کے لئے انہیں غزل لکھ کر دیا کرتا تھا۔ مگر غزل کے اچھے شعر خود رکھ لیتا تھا اور باقی بیکار اشعار شاگردوں کے حصہ میں آتے تھے۔

بہرحال اب یہ صورت تو نہیں ہے' مگر دانشور بننے کا شوق باقی ہے یہی وجہ ہے

کہ ہمارے بڑے بڑے سکہ بند دانشوروں میں سے کئی ایسے ہیں کہ جن کا کام دوسرے لوگوں نے کیا ہے۔ ان میں کچھ تو دوسرے کا کام پیسوں سے خریدتے ہیں۔ اور کچھ لوگ کسی ادارے کے ڈائریکٹریا سربراہ ہونے کی حیثیت سے اپنے ماتحت اسکالرز کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنا کام انہیں دے دیں۔ ان میں سے کچھ ماتحت اسکالرز تو خوشامد کے طور پر اپنی تحقیق اپنے سربراہ کے حوالہ کردیتے ہیں' اور کچھ کو اس کے لئے مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ اپنا کام اپنے ڈائریکٹر کو دے دیں بعد میں یہ ڈائریکٹر حضرات بین الاقوامی و قومی کانفرنسوں میں یہ مقالات اپنے نام سے پڑھتے ہیں اور داد و تحسین وصول کرتے ہیں۔

تقسیم کے بعد بہت سے عربی و فارسی کے اسکالرز ہجرت کرکے پاکستان آئے اور یہاں آکر انہیں مالی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا' ان حالات سے فائدہ اٹھا کر سندھ کے ایک مشہور دانش ور نے کہ جنہیں حکومت پاکستان و ایران سے تمغے اور انعامات بھی ملے ان لوگوں سے معاوضہ پر کام کرا کے اپنے نام سے چھپوایا اور مشہور محقق اور دانشور ہوگئے۔

اسی قسم کی ایک مشہور دانش ور شخصیت کراچی میں رہتی ہے کہ جنہیں بیک وقت ادب' فلسفہ' تاریخ اور حکمت پر مہارت ہے ان کے ماتحت کئی اسکالرز کام کرتے ہیں اور عربی و فارسی کے مسودات کی تصحیح کرکے ان کے نام سے شائع کرواتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی قومی و بین الاقوامی شہرت ہے۔

اس سارے عمل کا المیہ یہ ہوتا ہے کہ ابتدائی دور میں تو یہ حقیقت چند لوگوں کو معلوم ہوتی ہے ' مگر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ حقیقی دانشور اور اسکالرز فراموش کردیئے جاتے ہیں اور جن کے نام سے کتابیں چھپی ہیں۔ وہی اس کے اصلی خالق تسلیم کرلئے جاتے ہیں۔

اس مرحلہ پر یہ سوال بھی ذہن میں آتا ہے کہ لوگ آخر کیوں دانش ور بننا چاہتے ہیں اور اس صورت میں کہ جب ان میں اس کی صلاحیتیں بھی نہیں ہوتی ہیں؟ اس کا

جواب اس طرح سے آسان ہے کہ ہر شخص ہمیشہ زندہ رہنا چاہتا ہے اور اپنی موت کے بعد اس کی خواہش ہوتی ہے کہ اس کا نام باقی رہے۔ چونکہ تحریری الفاظ میں بڑی جان ہوتی ہے۔ اس لئے یہ لکھنے والے کو موت کے بعد بھی زندہ رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ لوگ کہ جو اپنے پیسہ اور اثر و رسوخ اور اختیارات سے دوسرے کی تخلیقات حاصل کرتے ہیں۔ اپنی دانشوری کو دنیاوی مقاصد کے حصول میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ یہی لوگ حکومت کو مشورے دیتے ہیں۔ منصوبے بناتے ہیں اور معاشرے کی تعلیمی و ثقافتی سرگرمیوں کا تعین کرتے ہیں۔ یہی لوگ ریڈیو، ٹی وی اور اخبارات کے ذریعہ اپنی دانشوری کی تشہیر کرکے اپنی شہرت چمکاتے ہیں۔

اس کے علاوہ ایک اور ذریعہ بھی ہے کہ جس سے دانشور بنا جاتا ہے اور وہ دوسروں کی تخلیقات کو چرانے اور نقل کرکے اپنے نام سے منسوب کرنے کا ہے۔ یہ لوگ بڑی چالاکی سے اکثر گمنام شاعروں و ادیبوں اور دانشوروں کی تحریروں کو اپنے نام سے معمولی رد و بدل کے بعد یا ایسے ہی شائع کردیتے ہیں۔ کبھی کبھی مختلف دانشوروں کی تحریروں سے اقتباسات لے کر اور انہیں باہم جوڑ کر ایک علیحدہ سی چیز تیار کی جاتی ہے اور اسے اپنی تحریر کہہ کر چھپوا لیا جاتا ہے۔

اس قسم کی نقل اور چوری نئی نہیں ہے بلکہ یہ ایک پرانی روایت ہے یہاں تک کہ علی ہجویری نے اپنی کتاب کشف المجوب میں اس کا ذکر کیا ہے کہ اگر کتاب کے ٹائٹل پر مصنف کا نام نہ ہو تو دوسرا شخص آسانی سے اسے اپنے نام سے منسوب کردیتا ہے۔ انہوں نے اپنی ایک مثال دی کہ ایک شخص نے ان کا دیوان ان سے مطالعہ کے لئے لیا اور بعد میں اسے اپنے نام سے مشہور کردیا۔ انہوں نے ایک اور بار دیکھا کہ ان کی ایک کتاب کسی اور کے نام سے لوگوں میں شہرت پارہی ہے۔ ہجویری نے اس صورت حال میں خود کو بڑا بے بس پایا اور اپنی کتاب میں ایسے دھوکہ بازوں پر لعنت بھیجتے ہوئے خدا سے دعا کی کہ وہ انہیں ہمیشہ گمنام رکھے۔ ان کی یہ دعا اس طرح سے قبول ہوئی کہ لوگ انہیں تو جانتے ہیں مگر ان کی تصانیف کو اڑانے والے تاریخ میں

روپوش ہوگئے ہیں۔

ہمارے ہاں اس قسم کے دانشوروں کو پنپنے کا اس لئے موقع مل جاتا ہے کیونکہ کوئی ان کی پکڑ نہیں کرتا ہے' وہ جو چوری کرتے ہیں اس کی نشان دہی نہیں کی جاتی ہے' اس لئے اب یہ عام ہے کہ انگریزی یا دوسری غیر ملکی زبانوں سے دانشوروں کی تحریروں کو اپنے نام سے منسوب کرکے شہرت حاصل کرلی جاتی ہے۔ اگر چند لوگوں کو اس کے بارے میں معلوم بھی ہوتا ہے تو یہ بات ایک محدود دائرے میں رہتی ہے اور عام قاری اس سے واقف نہیں ہوتا ہے۔ لیکن ان دانشوروں کے لئے یہ خطرہ ضرور ہوتا ہے کہ جب بھی راز فاش ہوگا۔ ان کی اونچی حیثیت گر کر نیچے آجائے گی۔ اور ان کی دانشوری کی حقیقت کھل جائے گی۔

سیمینار اور دانشور

ہمارے ہاں سیمیناروں' کانفرنسنوں اور ورک شاپوں کا جو سلسلہ شروع ہوا ہے اس نے خاص قسم کے پیشہ ور دانشور پیدا کئے ہیں کہ جنہوں نے اس میں مہارت حاصل کرلی ہے کہ ہر قسم کے سیمینار میں شرکت کرکے وہاں اپنی دانشوری کا اظہار کریں۔ اس قسم کے دانشور ہر موضوع پر بولنے کے لئے تیار رہتے ہیں اور انہیں یہ آرٹ آتا ہے کہ کس طرح لوگوں کو اپنی علمیت سے مرعوب کریں۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ ایک مقالہ تیار کرلیتے ہیں اور ہر سیمینار میں اسی میں رد و بدل کرکے اور اس کا موضوع بدل کر اسے پڑھ ڈالتے ہیں انہیں ہر سیمینار میں اس لئے بھی دعوت دی جاتی ہے کہ یہ لوگ اپنی مافیا بنالیتے ہیں کہ جو ایک دوسرے کی حمایت کرتی ہے' اور جو ان سے موافقت نہیں کرتا ہے اسے نظرانداز کردیا جاتا ہے۔

اکثر کانفرنسوں یا علمی و ادبی جلسوں میں کہ جہاں دانشور شرکت کرتے اور تقریر کرتے ہیں وہاں یہ بغیر تیاری کے آتے ہیں' اور اس وقت جو بھی انہیں سوجھ جائے بولدیتے ہیں' انہیں اس بات کا خیال نہیں ہوتا ہے کہ لوگ ان جلسوں اور کانفرنسوں میں اس لئے آتے ہیں کہ وہاں سے کچھ سیکھ کر واپس جائیں۔ مگر یہ دانشور جو حضرات بغیر تیاری کے آتے ہیں مائیک پر آکر جو بولنا شروع کرتے ہیں تو خاموش ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔ ان میں شاید اتنی بھی سمجھ نہیں ہوتی ہے کہ وہ سامنے بیٹھے سامعین کے چہروں کی بیزاری کو پڑھ سکیں۔ چونکہ اس قسم کی کانفرنسوں میں یہ لوگ لکھ کر نہیں لاتے اس لئے تقریر میں نہ کوئی مواد ہوتا ہے نہ نئی بات اور نہ ہی کوئی نقطہ نظر۔

دانشوروں کے اس رویہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں ان کانفرنسوں' سیمیناروں اور جلسوں کی کوئی وقعت نہیں رہی ہے' اور جیسا کہ لوگ کہتے ہیں کہ اکثر وہ یہاں دوست و احباب سے ملنے اور چائے پینے کی غرض سے آتے ہیں۔

ایسے موقعوں پر دانش ور اس بات کی بھی کوشش کرتے ہیں کہ وہ سامعین پر اپنا علمی رعب جھاڑتے ہیں' اپنی ایمانداری' سچائی اور دیانت داری کے تذکرے کرتے ہیں' اور اس طرح سے اپنی شخصیت کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں یوں یہ سیمینار اور کانفرنسیں دانشوروں کی شخصیوں کا ایک تماشہ بن کر رہ جاتی ہے اور شرکاء باہمی طور پر ایک دوسرے کی تعریف کرکے مطمئن ہوجاتے ہیں۔

دانشوروں کے اس کھوکھلے پن کی وجہ سے یہ سیمینار اور کانفرنسیں معاشرہ میں کوئی ذہنی تبدیلی لانے میں ناکام ہوگئی ہیں' ان کی کاروائی کمرے یا ہال تک محدود رہتی ہیں اور پھر چائے کے کپ کے ساتھ ختم ہوجاتی ہیں۔ اگر ان سیمیناروں اور کانفرنسوں کی کاروائی چھپتی ہے تو اس میں پڑھے جانے والے مقالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا دانش وری کا معیار کس قدر گرچکا ہے۔

دانشور اور انعامات

آج کل یہ دستور ہوگیا ہے کہ دانشوروں کی خدمات اور ان کی تخلیقات کو سراہنے کی خاطر انہیں مختلف قسم کے انعامات اور تمغے دیئے جاتے ہیں اکثر یہ انعامات کافی غور و خوض اور مقابلے کے بعد ان دانشوروں کو دیئے جاتے ہیں کہ جنھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعہ معاشرہ کو متاثر کیا ہو۔ جمہوری اور صنعتی ملکوں میں یہ انعامات ریاست کی طرف سے بھی ہوتے ہیں اور نجی بھی' وقت کے ساتھ ساتھ ان انعامات کی یا تو وقعت بڑھتی ہے یا گھٹتی ہے اس کا دارومدار اس پر ہوتا ہے کہ یہ انعامات دانشور کو اس کی میرٹ اور صلاحیت پر دیا جاتا ہے یا سیاسی طور پر اس کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اگر انعامات دانشور کو اس کی تخلیقی صلاحیتوں پر دیا جاتا ہے تو اس سے انعام اور دانشور دونوں مشہور ہوتے ہیں' اور معاشرہ میں ان کی عزت ہوتی ہے۔

مگر یہی انعامات اور تمغے آمرانہ طرز حکومت یا شخصی حکومتوں میں دانشوروں کو خریدنے کے لئے استعمال ہوتے ہیں حکومتیں اس صورت میں اپنی پسند کے دانشوروں کو ان انعامات سے نوازتی ہیں اور اس کے بدلہ میں ان کی حمایت حاصل کرتی ہیں۔ ان حالات میں دانشور ان آمروں کے ساتھ تعاون کرکے مالی فوائد حاصل کرتا ہے' اور خود بھی اس نظام کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ مگر ساتھ ہی میں ریاست کے یہ انعامات اور تمغے اپنی عزت اور وقار کھو دیتے ہیں۔

ہمارے ہاں اکثر انعامات و خطابات حکومت کی جانب سے دیئے جاتے ہیں اور بہت کم ایسے انعامات ہوتے ہیں کہ جو نجی ہیں۔ چونکہ حکومت کی ان انعامات اور اور

خطابات پر اجارہ داری ہے اس لئے ہمارے دانش ور اس بات کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنی کسی تحریر اور عمل سے حکومت کو ناراض نہیں کریں' تاکہ وہ بھی ان خطابات و انعامات کے مستحق بن جائیں۔ بدقسمتی سے اس پورے عمل میں دانشور یہ ثابت کردیتا ہے کہ اس کے نسامنے نہ تو کوئی مقصد ہے اور نہ ہی اس کا عوام اور معاشرے سے کوئی تعلق ہے بلکہ محض مالی منفعت کے لئے وہ خود کو بیچنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ اس لئے ان دانشوروں کی نظروں میں آمریت' فوجی حکومت اور جمہوری حکومت کا کوئی واضح فرق نہیں ہوتا ہے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ وہ نظریہ پاکستان کی حمایت میں لکھیں کہ جو آمرانہ حکومتوں کو سہارا دینے کے لئے ضروری ہے تو یہ لوگ گیتوں' نظموں' کہانیوں سے لے کر تحقیقی مضامین کے ذریعہ حکمران طبقوں کی ہدایات پر عمل کرتے ہیں اور اسی کے نتیجہ میں بالاخر انہیں حکومت سے خطابات مل جاتے ہیں۔

ہمارے دانشور اس وجہ سے بھی انعامات و خطابات کے خواہاں ہوتے ہیں' کیونکہ بحیثیت دانشور کے وہ خود کو معاشرے میں انتہائی کم تر پاتے ہیں' اس لئے ان کی خواہش ہوتی ہے کہ اگر وہ سرکار سے کوئی خطاب لے لیں تو اس سے ان کی عزت ہوجائے گی۔ یہی وجہ تھی کہ ایوب خان' یحیٰی خان اور ضیاء الحق کے دور میں ہمارے دانشور بغیر کسی شرم کے ان سے خطابات و انعامات قبول کرتے رہے ہیں' اور ان خطابات کو قبول کرتے ہوئے ان میں سے کسی نے ان کے جبرو تشدد اور عوام دشمنی پر کسی قسم کا اظہار نہیں کیا' اور نہ ہی ان کے انسانی حقوق کو کچلنے کے لئے قابل مذمت جانا' بلکہ ان کے ہاتھوں یا ان کی جانب سے خطابات کو قبول کرنے کا مطلب تھا کہ وہ ان کی پالیسیوں کی تصدیق کرکے ان کے ہمنوا ہوگئے ہیں۔

ہمارے دانشوروں کے اس رویہ کے برعکس یورپ کے ان دانشوروں کو دیکھئے کہ جنھوں نے اپنے نظریات و خیالات کو مقدم رکھتے ہوئے بڑے بڑے انعامات وخطابات کو ٹھکرا دیا۔ انہیں میں سے ایک مثال مشہور فرانسیسی آرٹسٹ گستاوٴ کوربے کی ہے جو کہ جمہوریت پسند تھا' جس نے فرانس کے انتہائی اہم انعام "ربن آف لیجن آف اونر

"کو لینے سے انکار کرتے ہوئے ایک خط نپولین سوم کو لکھا اور اس پر احتجاج کیا کہ اسے اس انعام کے لئے کیوں منتخب کیا گیا ہے اور یہ کہ اسے نامزد کرتے ہوئے کیوں اس سے اس کے بارے میں نہیں پوچھا گیا۔ وہ لکھتا ہے کہ :

" ان طریقوں سے عالی ماب میرے خیالات کو تبدیل نہیں کرسکیں گے' اور نہ ہی میرے فیصلوں پر اس سے کوئی اثر پڑے گا۔ میرے جو جمہوری اعتقادات ہیں وہ مجھے اس بات سے منع کرتے ہیں کہ میں کوئی ایسا انعام لوں کہ جو مجھے بادشاہت کے سلسلہ میں منسلک کردے۔ میرے اصول مجھے اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ میں یہ انعام لینے سے انکار کردوں جو کہ آپ نے میری غیر حاضری میں مجھے دیا ہے میں کسی بھی وقت، کسی بھی حالت میں' اور کسی بھی دلیل کے ذریعہ اسے قبول کرنے پر تیار نہیں۔ اور خاص طور پر اس وقت جب کہ ہر جانب سے لوگوں سے غداری کی جارہی ہے اور انسانی خود غرضی ' ضمیر کے اوپر فتح یاب ہورہی ہے۔ دیکھا جائے تو عزت و احترام کسی خطاب یا تمغے میں نہیں ہوتا ہے یہ انسان کے عمل اور اس عمل کے مقصد میں ہوتا ہے۔ کسی کی عزت اس کے خیالات و نظریات کی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ میں اس پر خوش اور مطمئن ہوں کہ میں ان خیالات پر سختی سے قائم ہوں کہ جو زندگی بھر سے میرے ساتھ ہیں۔ اگر میں ان سے غداری کروں گا تو اس صورت میں اپنی عزت کو داغدار کروں گا۔

ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے بھی میرے جذبات اس بات کے مخالف ہیں کہ میں ریاست کی جانب سے کوئی انعام قبول کروں۔ ریاست آرٹ کے معیار کو پرکھنے میں ایک نا اہل ادارہ ہے۔ جب وہ کسی انعام کا فیصلہ کرتی ہے تو درحقیقت یہ لوگوں کے ذوق کو غصب کرتی ہے۔ ریاست کا آرٹ کے معاملات میں دخل دینا آرٹسٹوں کے لیے تباہ کن اور بدلی پیدا کرنا ہے' کیونکہ اس طرح سے اسے اپنے آرٹ کے بارے میں دھوکہ دیا جاتا

ہے اور وہ اس کی میرٹ کے بارے میں شکی ہوجاتا ہے۔ اس سے آرٹ اس طرح بھی تباہ ہوجاتا ہے کہ اب یہ سرکاری قوانین کا ماتحت ہوجاتا ہے۔

جس دن ریاست ہمیں آزاد چھوڑ دے گی' اس دن ریاست اپنی سب سے اہم ذمہ داری کو پوری کرے گی۔ اس لئے مجھے اس کی اجازت دیجئے کہ میں اس عزت سے کہ جو آپ نے مجھے دی ہے انکار کروں۔ میں اب پچاس سال کا ہوں اور ہمیشہ سے میں نے آزاد زندگی گذاری ہے مجھے میری بقایا زندگی کو آزادانہ طور پر پورا ہونے دیجئے۔ کیونکہ جب میں مرجاؤں گا تو لوگ میرے لئے کہیں گے کہ اس کا تعلق کسی ملک یا چرچ یا ادارے یا اکیڈمی سے نہیں تھا۔ اور نہ ہی وہ کسی حکومت سے منسلک تھا میں صرف آزادی کی حکومت سے خود کو منسلک کرنا چاہتا ہوں۔"

یہ صحیح ہے کہ ہمارے اکثر دانشوروں نے خود کو فروخت کردیا ہے۔ یا اس کے لئے تیار ہیں مگر کچھ دانشور ابھی بھی ہیں کہ جنھوں نے دانشوروں کی لاج رکھ لی ہے اور خود کو انعامات و خطابات کی خاطر حکومت اور ریاست کے ہاتھوں گروی نہیں رکھا ہے۔ مثلاً" جب ۱۹۹۳ء میں حکومت نے مظہر علی خان کو جو مشہور صحافی اور دانشور تھے ان کی وفات کے بعد انعام دینے کا فیصلہ کیا تو ان کی بیوہ طاہرہ مظہر علی خان نے صاف انکار کردیا کہ مظہر علی خان کو ان کی زندگی میں ہر حکومت غدار اور ایجنٹ کہتی رہی اب اچانک سے ان کی خدمات یاد آگئیں۔ ان کا کہنا تھا کہ خدمات کا اعتراف کرنا عوام کا کام ہے حکومت کا نہیں۔

یہ ایک درست اقدام تھا' کیونکہ یہ حکومت کی پالیسی تھی کہ اس طرح سے وہ یہ ثابت کرے کہ وہ کس قدر فیاض اور روادار ہے کہ اپنے ناقدوں کی بھی قدر کرتی ہے اس طرح وہ انعام کے ذریعہ ایسے دانشوروں کو بھی اسی گروہ میں شامل کرنا چاہتی ہے کہ جس میں سرکاری و خوشامدی دانشور ہیں۔ اس لئے وہ دانشور کہ جو اپنے نظریات پر یقین رکھتے ہیں انہیں ریاست و حکومت کے ان ہتھکنڈوں سے ہوشیار رہنا چاہئے۔

جلاوطن دانشور

کسی بھی معاشرے میں جب علمی و ادبی کاموں پر پابندیاں عائد ہوجاتی ہیں اور سنسر شپ سخت ہوجاتی ہے تو اس صورت میں کچھ وہ دانشور ہوتے ہیں کہ جو حالات سے سمجھوتہ کرلیتے ہیں اور اپنے خیالات بدل کر وقت کے ساتھ ہوجاتے ہیں مگر وہ اپنے نظریات و خیالات اور اپنے مقصد میں پکے ہوتے ہیں ان کے لئے تین راستے ہوتے ہیں یا تو خاموش ہوجائیں اور لکھنے سے احتراز کریں یا اپنی تحریروں میں علامت کو استعمال کریں تاکہ سنسر شپ کی پابندیوں سے بچ سکیں یا ملک چھوڑ کر کسی ایسے ملک میں چلے جائیں کہ جہاں وہ اپنے تخلیقی کام کو جاری رکھ سکیں۔

آمریت یا فوجی حکومت کے دوران ہمارے کچھ دانشوروں نے خود ساختہ جلاوطنی کو اختیار کیا مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی اس جلاوطنی کے پس منظر میں کوئی سیاسی مقاصد نہیں تھے کیونکہ ان میں سے اکثر معافی مانگ کر اور سمجھوتہ کرکے واپس آگئے۔

پاکستان کے وہ دانشور جو معاشی وجوہات کی بنا پر ہجرت کرکے اور اب یورپ و امریکہ میں مقیم ہیں ان دانشوروں کے ہاں ہمارے ملک سے ایک رابطہ تو ہے لیکن ملک کے مسائل اور معاشرہ کی تلخیوں پر ان کی کوئی نگاہ نہیں ہے اسی لئے ان کی تحریریں بے جان اور غیر دلچسپ ہیں۔

پاکستان کے وہ دانشور جو غیر ملکی یونیورسٹیوں میں کام کر رہے ہیں اور پاکستان پر تحقیق کر رہے ہیں' ان میں سے اکثر اپنے اعلیٰ تخلیقی کام کے ذریعہ پاکستان کی تاریخ وسیاست و ثقافت کے نئے نئے پہلو سامنے لاتے ہیں اور ان کی وجہ سے پاکستان میں

رہنے والے دانشوروں کی معلومات میں بھی اضافہ ہوجاتا ہے۔ انہیں پاکستان یا پاکستانی معاشرہ پر تحقیق کرتے ہوئے یہ آسانی ہوتی ہے کہ ان کے پاس موضوع پر تمام مواد موجود ہوتا ہے اور جدید ذرائع ابلاغ کے ذریعہ یہ پاکستان کی نئی تبدیلیوں سے واقف رہتے ہیں۔

کیا ہماری کوئی دانشورانہ روایت ہے؟

پاکستان کے دانشوروں میں اکثریت شاعروں' افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں کی ہے یہاں پر مورخ ماہر علم بشریات ' عمرانیات' فلسفی ' آرٹسٹ اور سائنس دان بہت کم ہیں اس لئے ہمارے دانشوروں کی روایت کی تعمیر و تشکیل میں ادبی لوگ زیادہ حصہ لیتے ہیں اور اس میں بھی خصوصیت سے شاعرانہ طرز بیان' اور انداز ہماری تحریر کو متاثر کئے ہوئے ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہماری زبان کا ارتقاء اس طرح سے ہوا ہے کہ اس میں اظہار بیان شاعرانہ ہوتا ہے' اور اس اظہار بیان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں سادگی کی بجائے ہمیشہ پیچیدگی ہوتی ہے اور جو بات بھی بیان کی جاتی ہے اس کے لئے مقفیٰ و مسجع عبارت استعمال کی جاتی ہے' اس لئے ہمارے ہاں تحریر میں زبان پر زیادہ زور دیا جاتا ہے معنی پر نہیں اگر زبان خوبصورت اور شاعرانہ ہوتی ہے تو لوگ اس سے مسحور ہوجاتے ہیں اگر سادہ زبان میں اعلیٰ معانی بیان کئے جائیں یا افکار و نظریات کی تشریح کی جائے تو وہ لوگوں کو اس قدر متاثر نہیں کرتے ہیں۔ اس قسم کے اظہار بیان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس سے لوگوں کے جذبات تو ابھرتے ہیں مگر ان میں عقل پرستی اور دلیل کی کوئی گنجائش نہیں رہتی ہے۔ اس قسم کی بہت سی کوششیں کی گئیں کہ جن میں اردو زبان کے اس شاعرانہ ڈھانچہ کو بدلا جائے اور اسے ایک علمی زبان بنایا جائے۔ یہ کوششیں اسی وقت کامیاب ہوسکتی ہیں کہ جب ہم معاشرہ میں شاعروں کے کردار کو کم کرکے ان کی جگہ عالموں کو دیں جو سماجی اور نیچرل سائنس میں کام کرکے زبان کے ڈھانچہ کو بدلیں۔

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سلسلہ میں زبان کو مورد الزام ٹھہرانا غلط ہے کیونکہ زبان معاشرہ کے اظہار کا ایک ذریعہ ہے' جس قدر معاشرہ ذہنی طور پر ترقی کرے گا' اسی قدر اس کا اظہار زبان کے ذریعہ ہوگا' اگر کسی معاشرہ میں سائنس اور علمی کاموں کی کوئی ضرورت نہیں تو اس صورت میں زبان میں الفاظ کہاں سے آئیں گے؟ چونکہ ہمارے معاشرہ نے سماجی علوم یا نیچرل سائنس میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ اس لئے ان کے ہاں ان علوم سے متعلق اصطلاحات بھی نہیں ہیں۔ لٰہذا زبان اسی وقت ترقی کرے گی کہ جب معاشرہ آگے بڑھے گا۔

بدقسمتی تو یہ ہے کہ ہماری شاعرانہ اور افسانوی روایات بھی اس قدر کمزور ہیں کہ ان کا بین الاقوامی ادب میں کوئی خاص مقام نہیں ہے۔ کیونکہ ہمارے ہاں اکثر شعراء انہیں موضوعات کو بار بار دھراتے ہیں کہ جو قدیم شعراء کہہ چکے ہیں ابھی تک وہ شبہیات و استعارے ہیں کہ جن کا قدیم زمانہ میں استعمال ہوتا تھا' اگرچہ زمانہ آگے بڑھ گیا ہے اور معاشرہ میں تبدیلیاں آگئی ہیں مگر اب تک تیر و نشتر' کمان و نیزہ ہمارے ہاں استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ اب محبوب سامنے آگیا ہے مگر اب تک ہمارا شاعر اس کی جھلک دیکھنے کے لئے بے چین ہے۔

ہاں یہ ضرور ہوا ہے کہ کچھ دانشوروں نے مغربی ادبی روایات کی تقلید میں وہ اسلوب اختیار کرلیا ہے کہ جس سے ہمارا معاشرہ ابھی دوچار نہیں ہوا ہے۔ مغربی رجحانات کو اختیار کرکے یہ دانشور اپنی اوریجنلٹی سے اور محروم ہوگئے ہیں۔

دانشوروں میں جماعت بندی ہر جگہ ہوتی ہے۔ مگر ہمارے ہاں جس طرح سے یہ درجہ بندی ہے اس میں غیر گروہ کے دانشوروں کی صلاحیتوں کو تسلیم کرنے اور ان کی تعریف کرنے کی بجائے ان سے سخت نفرت کی جاتی ہے' اور ان کے ہر اچھے و برے کام کو ایک ہی معیار پر پرکھا اور دیکھا جاتا ہے۔ اس رویہ کی وجہ سے یہ ایک دوسرے سے کچھ سیکھتے نہیں ہیں' بلکہ اپنے ذوق کو بھی کھودیتے ہیں۔

اس سلسلہ میں یہ رجحان ہے کہ اگر کوئی دانشور اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے ابھرتا

ہے تو اس کو بالکل نظرانداز کردیا جاتا ہے اور اس کی تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف نہیں کیا جاتا ہے' تاکہ اس رویہ سے وہ مایوس ہوکر یا تو کسی جماعت و گروہ سے سمجھوتہ کرلے یا اپنے علمی و ادبی کام سے دستبردار ہوجائے؟

دوسرا رجحان یہ ہے کہ اگر اپنی تحریر میں کسی دانشور کے خیالات یا نقطہ نظر کو استعمال کیاجاتا ہے تو اس کا کوئی حوالہ نہیں دیا جاتا ہے۔ اور اس انداز میں بیان کیا جاتا ہے کہ جس سے یہ معلوم ہو کہ یہ انہیں کا نقطہ نظر ہے۔ خاص طور سے اگر یہ خیالات کسی ابھرتے ہوئے دانشور کے ہیں۔ اور ابھی یہ مقبول عام نہیں ہوئے ہیں۔ اگر انہیں کوئی شہرت یافتہ دانشور اپنے مضمون یا مقابلہ میں استعمال کرلیتا ہے۔ تو یہ اسی سے منسوب ہوجاتے ہیں اس قسم کی دانشورانہ بددیانتی کی کئی مثالیں ہمارے ہاں موجود ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ دانشورں میں دانش و علم کی کمی ہے' جو اس کو اس بددیانتی پر اکساتی ہے۔

اس بددیانتی کو اختیار کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان پر کوئی اس کا الزام نہیں لگاتا ہے' ایک ایسے معاشرے میں کہ جہاں کم علمی و جہالت ہو' وہاں یہ روایات خوب پروان چڑھتی ہیں۔ کیونکہ سوائے دو چار لوگوں کے اور کسی کومعلوم ہی نہیں ہوتا ہے کہ کہ یہ چوری کہاں سے کی گئی ہے۔

کم علمی' اور کھوکھلے پن کی وجہ سے ہمارے ہاں تنقید کو برداشت کرنے کا بھی مادہ نہیں ہے۔ اگر کسی دانشور کو اس کی غلطیوں کی طرف نشان دہی کی جائے تو اس صورت میں وہ جانی دشمن بن جاتا ہے۔ اس لئے ہمارے ہاں ان تنقید یا تعریف و توصیف کا نام ہے یا دشمنوں کے پرخچے اڑانے کا۔ وہ تنقید کہ جس کے ذریعہ دانش ور اپنی تحریر کوسدھارے ' خوبصورت کرے اور بہتر بنائے اس کا رواج ہمارے ہاں نہیں ہے۔

ہمارے اس کھوکھلے پن کا نتیجہ ہے کہ ہمارے دانشوروں کی بجائے' غیر ملکی دانشور ہمارے معاشرہ کے مختلف پہلوؤں پر تحقیقی کام کر رہے ہیں' اور ہم اس بات

کے عادی ہوگئے ہیں کہ اپنے معاشرہ کا تجزیہ ان کے نقطہ نظر سے کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ جو بھی کام کرتے ہیں اس کے پس منظر میں ان کی علمی گہرائی' اور تحقیقی ذرائع ہوتے ہیں اس لئے ان کے کام میں منطق اور دلیل ہوتی ہے اور اس وجہ سے ان کی تحریر کی عزت ہوتی ہے اور اس پر اعتبار کیا جاتا ہے۔

چنانچہ یہ لوگ ہیں کہ جو ہمارے لئے تاریخ لکھتے ہیں ہمارے چھپے ہوئے آثار قدیمہ کو دریافت کرتے ہیں اور ہمارے ماضی کی تعمیر و تشکیل میں مدد دیتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں جو ہمارے معاشرہ ' اس کے رجحانات اور اس کی تبدیلیوں کے بارے میں بتاتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں کہ جو ہماری معاشی صورت حال کا تجزیہ کرکے ہمارے لئے منصوبے بناتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جو ہمارے تعلیمی نظام کے نقائص سامنے لا کر اس میں اصلاحات کا مشورہ دیتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ جو ہمارے ماحول اور ہمارے ترقیاتی منصوبوں کی اہمیت سے ہمیں آگاہ کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ اپنے ماہرین اور عالموں کی کمی یا نہ ہونے کی وجہ سے ہم مجبور ہیں کہ ان پر اور ان کی تحقیقات پر مکمل بھروسہ کریں۔ اور ہمارے دانشوروں کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا ہے کہ وہ محض ان کی تقلید کریں اور ان کے نقطہ نظر کو اختیار کریں۔

ہمارے تعلیمی اور ہمارے تحقیقاتی ادارے ایسے دانشور پیدا کرنے میں ناکام ہوچکے ہیں کہ جو معاشرے کی بدلتی ہوئی صورت حال کو سمجھ کر اس کا تجزیہ کرسکیں لہٰذا ہر موضوع پر اور ہر شعبہ کے لئے ہمیں غیر ملکی دانشوروں ' عالموں اور ماہروں کی ضرورت ہوگئی ہے۔

وہ قومیں کہ جن کی اپنی کوئی دانشورانہ روایات نہیں ہوتی ہیں' ان کی دنیا میں کوئی عزت نہیں رہتی ہے۔ کیونکہ کسی قوم کی اسی وقت عزت ہوتی ہے کہ جب وہ دنیا کی تہذیب میں کوئی اضافہ کر رہی ہو۔ اور اس لئے غور کرنے کا مقام ہے کہ دنیا کی ترقی میں ہمارا کیا حصہ ہے؟ ہم نے سائنس و ٹیکنالوجی' طب' فلسفہ' آثار قدیمہ' علم بشریات' عمرانیات اور دوسرے علوم میں کیا کارہائے نمایاں کئے ہیں؟ کیونکہ ہم یہ مطالبہ نہیں

کرسکتے ہیں کہ ہماری کم علمی اور کند ذہنی کے باوجود ہماری عزت کی جائے۔

اس دانشورانہ روایات کی کمزوری کے اثرات ہمارے معاشرے پر کئی طرح سے ہوتے ہیں مثلاً" سب سے پہلا اثر تو یہ ہوا ہے کہ ہمارا معاشرہ ثقافت اور کلچر سے بالکل بے بہرہ ہوگیا ہے۔ ہم ایک ایسا معاشرہ بن گئے ہیں کہ جس میں تہذیبی روایات باقی نہیں رہی ہیں ' ہمارے رویوں میں اور ہماری عادتوں میں کوئی سلیقہ باقی نہیں رہا ہے' ہماری گفتگو اور ہمارے آداب کھردرے اور غیر مہذب ہوگئے ہیں ہماری فطرت میں تشدد و بربریت آگئی ہے۔ ہم نقل اور تقلید پرستی کو فن اور دانش کی معراج سمجھنے لگے ہیں۔ اور ایک ایسا معاشرہ بن گئے ہیں کہ جہاں تخلیقی صلاحیتوں کے لئے کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے۔

اس لئے ہمارے دانشوروں اور معاشرہ کے لئے ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ ماضی کی خوشگوار اور سہانی یادوں میں سہارا لے کر حال کی حقیقتوں کو بھول جائیں اور ان کے سامنے جو چیلنج ہیں ان سے آنکھیں بند کرلیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ دن بدن اور زیادہ تنزلی کی جانب جارہا ہے۔

حصہ دوم

عروج و زوال اور پس ماندگی

عروج و زوال کا فلسفہ

قوموں کا عروج و زوال دنیا کی تاریخ میں ایک پیچیدہ' پراسرار اور غم و اندوہ سے بھرپور عمل ہے۔ یہ ایک ایسا المیہ ہے کہ جو انسانی ذہن کو افسردہ کردیتا ہے اور وہ اس اتار چڑھاؤ کے عمل سے یاس و نا امید کا شکار ہوجاتا ہے۔ اگرچہ انسانی ذہن نے قوموں کے عروج و زوال کو سمجھنے کی بہت کوشش کی ہے' مگر اس کے لئے اب تک یہ ایک نہ حل ہونے والا معمہ ہے کہ ایک قوم کن حالات میں عروج حاصل کرتی ہے' تہذیب و تمدن میں کمال تک پہنچی ہے اور پھر ایک شاندار ماضی کو چھوڑ کر زوال پذیر ہوجاتی ہے۔

ابن خلدون نے حکومتوں' شاہی خاندانوں اور قوموں کے عروج و زوال کو پہلی مرتبہ سائنسی انداز میں سمجھنے کی کوشش کی' اور اس عمل کے پس منظر میں جو قوانین کارفرما ہیں انہیں دریافت کرنے اور ان کے اثرات کو متعین کرنے کی کوشش کی۔ وہ عروج و زوال کے اس عمل کو انسانی زندگی سے تشبیہہ دیتا ہے کہ جس طرح ایک انسان بچپن' جوانی اور بڑھاپے کے درجات طے کرکے موت سے ہم آغوش ہوجاتا ہے' اسی طرح سے قومیں بھی ان مرحلوں سے گذر کر زوال پذیر ہوجاتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ موت سے دوچار ہونا ہر قوم کی تقدیر میں لکھا ہوا ہے اور ایسی کوئی صورت نہیں ہے کہ قومیں خود کو موت سے بچا سکیں اور اپنی زندگی کو طول دے سکیں۔ ابن خلدون کے فلسفہ میں مجبوری اور تقدیر کے تابع ہونا قوموں کی زندگی ہے۔

ابن خلدون کے بعد اور دوسرے مفکروں نے اس مسئلہ پر سوچ و بچار کی' ان

میں دو نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اوسوالڈ اشپنیگلر' اور آرنلڈ ٹوائن بی اشپنیگلر نے اپنی کتاب "زوال مغرب" میں تہذیبوں کے عروج و زوال کا مطالعہ کیا ہے اور ان قوانین کی نشاندہی کی ہے کہ جو اس ڈرامہ کے پس منظر میں عمل پیرا ہیں۔ اس کے نظریہ کے تحت ایک تہذیب جن مرحلوں سے گزرتی ہے اس کی مثال موسموں کی طرح ہے' یعنی گرمی' سردی' بہار اور خزاں۔ جب تہذیب خزاں کے موسم میں داخل ہوتی ہے تو اس کے بعد موت اس کا مقدر ہوجاتا ہے لہٰذا موت سے خوف زدہ اور ڈرنے کی بجائے اس کو تسلیم کرلینا چاہیے۔ یہاں اشپنیگلر کے لہجہ واضح اور صاف ہوجاتا ہے۔ وہ یونانی المیہ پر یقین کرتے ہوئے آخری دور میں بہادری سے موت کو قبول کرنے پر زور دیتا ہے اس کی دلیل یہ ہے کہ جب ایک تہذیب اعلیٰ کلچر تخلیق کرلیتی ہے تو اس کے ساتھ ہی اس کی تخلیقی قوتیں ختم ہوجاتی ہیں۔ اور وہ خستگی کے اس مرحلہ پر پہنچ جاتی ہے کہ جہاں موت ہی اس کے لئے نجات کا ذریعہ بن کر آتی ہے۔

اور دیکھا جائے تو اس میں کسی حد تک صداقت بھی ہے' کیونکہ جب کوئی تہذیب اپنے عروج پر پہنچ کر ختم ہوجاتی ہے' تو زوال کے دور میں اس کی زندگی انتہائی تلخ ہوجاتی ہے۔ عزت و توقیر کے بعد ذلت و خواری قوموں کو نفسیاتی مریض کردیتی ہے۔ ایک طرف اس کا ماضی ہوتا ہے تو دوسری طرف حال' ایسی صورت حال میں قومیں کبھی ماضی کی شان و شوکت میں ڈوب جاتی ہیں تو کبھی حال کی پسماندگی میں۔ ان کے لئے مشکل ہوتا ہے کہ وہ خود کو اس دلدل سے نکال کر اپنے لئے کوئی نئی راہ تلاش کریں۔

آرنلڈ ٹوائن بی وہ تیسرا مورخ ہے کہ جس نے ابن خلدون اور اشپنیگلر کے بعد تہذیبوں کے عروج و زوال کے بارے میں ایک نئی راہ دریافت کی ہے۔ وہ تہذیبوں کے اتار چڑھاؤ میں جس عمل کو دیکھتا ہے وہ یہ ہے کہ ہر تہذیب کو مسلسل چیلنج کا سامنا کرنا پڑتا ہے' اگر وہ چیلنج کا موثر جواب دیتی رہتی ہے تو اس کے نتیجہ میں آگے بڑھتی رہتی ہے' لیکن جیسے ہی اس کا رد عمل کمزور ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی اس میں

زوال کے اثار شروع ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا اس کی دلیل یہ ہے کہ کوئی بھی تہذیب اس وقت تک زندہ رہ سکتی ہے کہ جب تک اس میں چیلنج کا جواب دینے کی صلاحیت ہے۔ ٹوائن بی کے ہاں تہذیبوں اور قوموں کی بقا کی امید اس امر پر ہے کہ وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو زندہ رکھ کر حالات کا مقابلہ کریں۔

تہذیبوں اور قوموں کے عروج و زوال کے عمل کو سمجھنے کے لئے ان تینوں فلسفیوں کے افکار مدد کرتے ہیں' مگر انسانی تاریخ اس قدر پیچیدہ اور الجھی ہوئی ہے کہ ہم ان قوانین کا اطلاق تمام تہذیبوں پر نہیں کرسکتے ہیں' عام طور پر ان پر جو اعتراض کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ پہلے یہ ایک فریم بناتے ہیں' اور پھر اس میں تاریخ سے واقعات کو چن کر اس میں جڑ دیتے ہیں۔ اس لئے ان کی دریافت شدہ قوانین پوری طرح سے تمام تہذیبوں اور قوموں کی تاریخ پر پورے نہیں اترتے ہیں۔

مثلاً" اشپنیگلر یورپ کے عروج کو فیوڈل ازل اور اس کے کلچر سے منسلک کرکے دیکھتا ہے' اس کے نزدیک فیوڈل ازم کے خاتمہ کے ساتھ ہی اعلیٰ کلچر کی تخلیق ختم ہوگئی اور اس کی جگہ عمومی کلچر پیدا ہوا کہ جو انتہائی کم تر اور ناقص ہے۔ لہٰذا اس کے لئے زوال مغرب یہی ہے کہ کلچر کی گہرائی کی جگہ عمومیت لے رہی ہے اس طرح یہ زوال ایک طبقاتی نقطہ نظر ہے۔

ان فلسفیوں کے علاوہ مختلف مورخوں نے قوموں کی تاریخ لکھتے ہوئے ان کے زوال کے اسباب کی نشاندہی کی ہے۔ مثلاً" جب کوئی قوم اپنے ذرائع آمدن سے زیادہ خرچ کرنے لگے۔ جیسا کہ رومی سلطنت میں ہوا۔ جب کوئی چھوٹی ریاست امپیریل پاور بنتی ہے تو اس کے نتیجہ میں اس کا پھیلاؤ ہوجاتا ہے اور بعد میں آنے والی نسلیں سامراجی عادات اختیار کرلیتی ہیں جس کے نتیجہ میں سماجی راسخ العقیدگی پیدا ہوتی ہے' معاشرہ تعلیم و تجارت میں ٹھٹھر کر رہ جاتا ہے' انتظامیہ جدیدیت کے خلاف ہوجاتی ہے۔

جب ریاست امپائر بنتی ہے تو اپنے ذرائع سے آگے بڑھ کر دوسروں کے ذرائع پر

انحصار کرنے لگتی ہے اور اس کے ساتھ ہی خود انحصاری کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔

امپائر' اپنی محکوم قوموں کے قومی جذبات کو نظرانداز کرکے اس پر زور دیتی ہے کہ وفاداری صرف مرکز سے رہے' اس کے نتیجہ میں جب محکوم قوموں کی طرف سے مزاحمت ہوتی ہے تو یہ خانہ جنگی کو پیدا کرتی ہے' ایک وقت تو امپیریل طاقت ان خانہ جنگیوں سے نمٹ سکتی ہے' مگر ایک وقت وہ آتا ہے کہ جب مرکزی طاقت کمزور ہوجاتی ہے اور وہ ان بغاوتوں کو کچل دینے میں ناکام رہتی ہے' لہٰذا اس کے نتیجہ میں لاقانونیت پھیلتی ہے' شاہرائیں غیر محفوظ ہوجاتی ہیں' تجارت و صنعت و حرفت میں کمی آجاتی ہے' زراعت کے متاثر ہونے سے ریونیو کا خاتمہ ہوجاتا ہے۔ اس صورت حال میں کرپشن اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے' اور بدعنوان افراد دولت مند ہوجاتے ہیں جبکہ ریاست غریب سے غریب تر ہوجاتی چلی جاتی ہے۔ ان حالات میں امپائر کے خاتمہ کے بعد قومیں اپنی سرحدوں پر واپس آجاتی ہیں۔

اگر اس نقطہ نظر سے قدیم اور جدید قوموں کے عروج و زوال کو دیکھا جائے تو اس عمل کو پوری طرح سے سمجھا جاسکتا ہے' خصوصیت کے ساتھ یہاں پر دو جدید امپیریل طاقتوں کا ذکر ضروری ہے ترکی اور برطانیہ ۔

سلطنت عثمانیہ کو جب پہلی جنگ عظیم میں شکست ہوئی' اور ترکی میں مصطفیٰ کمال اتا ترک نے جمہوریت قائم کی' تو اس نے یہ فیصلہ کیا کہ عثمانی سلطنت اور اس کے تمام سامراجی اداروں کو ختم کردیا جائے' اور ترکی کو اس کی اصل سرحدوں میں محفوظ کرکے آئندہ سے جنگ سے دور رہا جائے' کیونکہ صرف اس صورت میں ترکی خود کو محفوظ رکھ سکتا تھا' اس کے بعد ہی سے ترکی میں ایک علیحدہ قومیت کا احساس پیدا ہوا اور انہوں نے ترکی کلچر کی ترقی کی طرف توجہ دی۔

دوسری مثال برطانیہ کی ہے کہ جس نے دوسری جنگ کے بعد اس بات کو محسوس کرلیا کہ اس کی محکوم قوموں میں قومیت کے جذبات اس قدر شدید ہوگئے ہیں کہ ان پر اب حکومت کرنا مشکل ہے' اس لئے انہوں نے آہستہ آہستہ ان ملکوں کو آزاد کرنا

شروع کردیا اور خود اپنی سرحدوں پر واپس چلے گئے۔

اگرچہ امپیریل طاقتوں کی واپسی رضاکارانہ نہیں ہوتی ہے تو اس صورت میں محکوم قومیں مزاحمت کے ذریعہ انہیں مجبور کرتی ہیں کہ وہ شکست تو تسلیم کرلیں اور اپنی حاکمیت کو ختم کردیں۔

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ تمام تہذیبوں کے عروج و زوال کی ایک مدت مقرر نہیں کی جاسکتی ہے کیونکہ ہر تہذیب اپنے عروج و کمال کے کئی درجے رکھتی ہے۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ زوال پذیر تہذیب ایک دم زوال پذیر نہیں ہوتی بلکہ اس عمل کے دوران اس میں ٹھہراؤ بھی آجاتا ہے اکثر یہ دلیل دی جاتی ہے کہ عالمی ریاست یا امپیریل طاقت وحشی قبائل کے حملوں کے نتیجہ میں تباہ ہوجاتی ہے' اس کے برعکس ان حملوں کے نتیجہ میں یہ طاقتیں ایک نئی توانائی بھی حاصل کرتی ہیں اور ان قبائل کو اپنے اندر جذب کرکے دوبارہ سے تازم دم ہوجاتی ہیں جیسے مصر میں ہائی کوس (HysKos) اور اسلام میں ترکوں اور منگولوں نے انہیں نئی زندگی دی۔ مگر جب معاشرہ یا تہذیب ان وحشی قبائل کو اپنے میں ضم نہ کرسکے تو اس صورت میں یہ اسے تباہ کردیتے ہیں' جیسے کہ جرمن قبائل نے رومی سلطنت کو ختم کردیا۔

اس مرحلہ پر عروج و ترقی اور زوال و پسماندگی کی اصطلاح کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔ اور اس ضمن میں یہ بھی سمجھنا ضروری ہے کہ شاہی خاندان' قوم اور تہذیب میں کیا فرق ہے؟ جب تک شاہی خاندانوں کی حکومت ہوتی تھی اس وقت تک ایک قوم یا ملکی و قومی سرحد کا کوئی تصور نہیں تھا۔ حکمران خاندان اپنی سیاسی طاقت کو بڑھاتے ہوئے نئے علاقے پر قبضہ کرتے تھے اور نئی اقوام کو محکوم کرتے تھے' ان کی یہ سرحدیں وقت کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہتی تھیں۔ لیکن جب یورپ میں تحریک اصلاح مذہب اور فرانسیسی انقلاب کے بعد قوم کا تصور آیا تو اس کے ساتھ ہی ملکی و قومی سرحدیں بھی متعین ہونا شروع ہوگئیں۔ اگرچہ اس میں رد بدل ہوتا رہا' مگر قوم کے ساتھ ساتھ ملک

کی سرحدوں کے بارے میں تعین ہوگیا۔ اسی طرح یورپی تہذیب کے اندر قومی تہذیبیں ہیں اور ان سب نے مل کر یورپی تہذیب کو تخلیق کیا ہے۔ اگرچہ ان قومی تہذیبوں کے اندر برابری نہیں ہے۔ کچھ سماجی و معاشی طور پر ترقی یافتہ ہیں۔ اور کچھ پس ماندہ' مگر مجموعی طور پر تمام یورپ کو ایک تہذیب کے دائرے میں لایا جاتا ہے۔

کسی قوم یا تہذیب کے عروج کو ایک زمانہ تک سیاسی نقطہ نظر سے دیکھا جاتا تھا' جن قوموں نے فتوحات کے ذریعہ نئے ملکوں پر قبضہ کیا ہوتا تھا۔ اور دوسری قوموں کو محکوم بنایا ہوتا تھا' اسے عروج کا زمانہ کہا جاتا تھا' اور جب ان کی سیاسی قوت ٹوٹتی تھی تو اسے زوال سے تعبیر کیا جاتا تھا' جیسے یونانی' رومی اور عربوں کی سیاسی طاقت کے عروج و زوال کو تاریخ میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اور نو آبادیاتی دور میں یورپی طاقتون کے اتار چڑھاؤ کو بھی اسی سیاسی پھیلاؤ کے نقطہ نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

موجودہ دور میں یہ صورت حال بدل گئی' اب قوموں کی ترقی کو ان کی معاشی ترقی کے پیمانے سے جانچا جاتا ہے' عالمی منڈی میں ان کی ساکھ' اور ان کا مالی استحکام' ان کی حیثیت کو متعین کرتا ہے۔

جہاں تک کسی تہذیب کے عروج کو جانچنے کا مسئلہ ہے' تو اس کی حیثیت اس سے متعین ہوتی ہے کہ اس نے علمی و ادبی و سائنسی لحاظ سے دنیا کو کیا دیا؟ اگر کوئی تہذیب تخلیقی و ذہنی لحاظ سے دوسری تہذیبوں سے برتر ہے' تو اس کا احترام و وقار مستحکم رہتا ہے' مگر جیسے ہی اس کی تخلیقی صلاحیتیں ختم ہوجاتی ہیں اور اس کے پاس عالمی معاشرے کو دینے کے لئے کچھ نہیں رہتا ہے اس طرح سے وہ زوال پذیر ہوجاتی ہے۔

یہاں پر ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا قوموں اور تہذیبوں کے عروج و زوال کے اثرات کو صرف حکمراں طبقے اور امراء ہی محسوس کرسکتے ہیں یا ان سے عوام بھی متاثر ہوتے ہیں؟ یہ ضرور ہے کہ جب بھی سیاسی و معاشی طور پر قوموں کا عروج ہوتا ہے تو اس کے نتیجہ میں سب سے زیادہ فائدے طبقہ اعلیٰ کے لوگ اٹھاتے ہیں اور

ان کا معیار زندگی بلند ہوجاتا ہے۔ عام آدمی کو صرف اس صورت میں فائدہ ہوتا ہے کہ جب وہ حکمران طبقوں کے متوسلین میں شامل ہوجائے اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے میں مددگار ہو' جیسے انجنیئر و معمار ان کے لئے محلات و باغات و عالیشان عمارات بناتے تھے' صنعت کار و دست کار اور ہنر مند ان کے لئے اسلحہ ' ہتھیار اور اوزار و آلات بناتے تھے۔ عالم و سائنس دان ان کی ذہنی و جسمانی ضروریات کے لئے تخلیقات کرتے تھے' اور جب تک یہ سیاسی و معاشی طور پر مستحکم رہتے تھے معاشرہ میں ان کی سرگرمیوں سے ہنر مند لوگوں کے طبقات مالی فائدہ اٹھاتے رہتے تھے' مگر زوال کے زمانہ میں جب ان کے ذرائع آمدن جیسے جیسے کم ہوتے جاتے تھے اسی طرح سے ان کی ضروریات بھی گھٹتی جاتی تھیں' اور جب یہ نوبت پہنچ جاتی تھی کہ ان کے لئے اپنے اور اپنے خاندان کی بقا مشکل ہوجاتی تھی تو اس کے نتیجہ میں ان کے متوسلین طبقات بے روزگاری کا شکار ہوکر مالی پریشانیوں میں الجھ جاتے تھے۔

زوال کے عہد کی علامات سب سے زیادہ عمارتوں میں نظر آتی ہیں' کیونکہ عروج کے زمانہ میں عالیشان عمارتیں تعمیر ہوتی تھیں اور یہ تصور ہوتا تھا کہ عمارت ان کے عروج کو اپنی وسعت و بلندی سے ظاہر کرے۔ ان عمارات کی عروج کے زمانہ تک تو دیکھ بھال ہوتی رہتی تھی۔ مگر زوال کے آتے ہی یہ بے حسی کا شکار ہونا شروع ہوجاتی تھیں۔ ان کے مالکان کے پاس اس قدر سرمایہ نہیں رہتا کہ جس سے وہ ان کو بہتر رکھ سکیں' چنانچہ اس کی مثال پرتگال سے دی جاسکتی ہے کہ جس نے اپنی سلطنت کے عروج کے زمانہ میں چھوٹے شہروں اور قصبوں میں بھی عالیشان چرچ تعمیر کرائے' مگر زوال کے زمانہ میں یہ خستگی و کہنگی کا شکار ہوگئے کیونکہ ان کی دیکھ بھال کے لئے کوئی روپیہ پیسہ نہ حکومت کے پاس تھا اور نہ ہی لوگوں کے پاس' اور یہی کچھ آخری عہد مغلیہ میں ہوا کہ مغلوں کی بنائی ہوئی عمارات ٹوٹنا شروع ہوگئیں' اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ شاہی قلعہ میں کہ جہاں بادشاہ معہ خاندان کے رہتا تھا' خستہ ہونا شروع ہوگیا۔

جب حکمران طبقے ذرائع آمدن کے ساتھ ساتھ غریب و مفلس ہونا شروع ہوجاتے

تھے تو اہل فن کی سرپرستی بھی ختم ہوجاتی تھی۔ اور معاشرہ میں وہ لوگ کہ جنھوں نے کسی فن کو تخلیق کیا تھا اور اسے عروج پر پہنچایا تھا وہ فن آہستہ آہستہ مرجاتا ہے' اور آنے والی نسلوں میں اس کا ماہر اور استاد کوئی باقی نہیں رہتا ہے۔ اور ایک وقت وہ آتا ہے کہ جب اسی قوم کے لوگ اپنی ماضی کی یادگاروں کو دیکھ کر حیرت میں پڑجاتے ہیں اور ان کی تعمیر کو معجزے سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔

زوال کا احساس

اب ہم خود سے یہ سوال کرتے ہیں کہ زوال ہم کیسے محسوس کرتے ہیں؟ اس کا جواب دینے کے لئے ہمیں تاریخ سے مدد لینا ہوگی' مثلاً" قبائلی معاشروں میں کہ جہاں زندگی تبدیلی کے عمل سے دوچار نہیں ہوتی ہے' وہاں زوال کا کوئی تصور نہیں ہوتا ہے' وہاں معاشرہ ایک ایسی حالت میں رہتا ہے۔ ایک ایسے معاشرے کی تاریخی معلومات بھی بڑی محدود ہوتی ہیں اور ان کے سامنے ایسا کوئی ماڈل پیش نہیں کرتیں کہ جن سے وہ اپنا مقابلہ کرسکیں' اور ترقی کے عوامل کو سمجھ سکیں۔ لہٰذا قبائلی معاشرے' ترقی' عروج اور زوال کے تصورات سے ناآشنا ہوتے ہیں۔

اس لئے زوال کا احساس ان معاشروں میں ہوتا ہے کہ جو کسی بڑی تہذیب کو پیدا کرتے ہیں تہذیب کی اس تخلیق میں ان کی فتوحات ہوتی ہیں کہ جن کی بنیاد پر وہ بڑی بڑی سلطنتیں بناتے ہیں اور اپنے ذرائع آمدنی کے بڑھنے کے نتیجہ میں ایک اعلیٰ کلچر تخلیق کرتے ہیں۔ لیکن جب یہ سلطنتیں ٹوٹ کر بکھرتی ہیں' تو آنے والی نسلیں اپنی پچھلی تاریخ کی روشنی میں اپنا جائزہ لیتی ہیں' اور اپنا مقابلہ ماضی سے کرکے تجزیہ کرتی ہیں کہ وہ پسماندہ اور زوال پذیر ہوگئی ہیں' مثلاً" اہل یونان' رومی' عرب' عثمانی ترک اور ہندوستانی مغل سلطنتوں کے ٹوٹ جانے کے بعد جو سیاسی و معاشی ابتری آئی اس نے معاشرہ کو یہ احساس دلایا کہ وہ زوال کی حالت میں ہیں۔

اس لئے انہوں نے عروج و زوال کا مقابلہ اس طرح سے کیا کہ ان کی سلطنت کی وسعت ختم ہوگئی' فتوحات کا سلسلہ رک گیا' بغاوتوں نے سلطنت کو کھوکھلا کردیا' اور

معاشرہ میں آرٹ و فن کی ترقی ختم ہوگئی۔ عروج و زوال کے درمیان یہ مقابلہ جب ہی ممکن ہوتا ہے کہ جب ان قوموں کے پاس تاریخی معلومات ہوں' اگر ان کا تاریخی سرمایہ کم ہوتا ہے' یا اس سے انہیں محدود معلومات ملتی ہیں تو وہ نہ عروج سے واقف ہوسکتے ہیں اور نہ ہی زوال سے۔ اس کی مثال ہندوستان سے دی جاسکتی ہے کہ قدیم ہندوستان کے بارے میں جب تک تاریخی معلومات محدود رہیں' اہل ہندوستان اپنے عروج و زوال سے بے خبر رہے' اور اس لئے ان کے لئے ماضی پرکشش نہیں رہا۔ لیکن جب جدوجہد آزادی کے دوران آثار قدیمہ کی دریافتوں کے ساتھ ساتھ ہندوستان کے ماضی کی شان و شوکت ابھرتی رہی' اس طرح سے اہل ہندوستان کو اپنے زوال کا احساس ہوتا گیا' اور ان کے لئے ماضی پرکشش بنتا چلا گیا۔

جب ماضی کی معلومات کی بنیاد پر عروج و زوال کا موزانہ کیا جاتا ہے تو اس میں ماضی کے جو مثبت پہلو ہوتے ہیں ان کا زوال کے زمانہ سے مقابلہ کیا جاتا ہے' جس کی ایک مثال آخری عہد مغلیہ کا زمانہ ہے' اس دور میں جو مورخ یا دانشور معاشرے کے زوال پر لکھ رہے تھے ان کے ذہن میں اکبر' جہاں گیر' شاہ جہاں اور اورنگزیب کے عہد تھے کہ جب مغل امپائر مستحکم تھی۔ فتوحات ہورہی تھیں' امراء سلطنت کے وفادار تھے' بادشاہ کی شخصیت قابل احترام تھی' اور ملک میں بغاوتوں کی کمی تھی' لہٰذا جب آخری عہد مغلیہ میں بادشاہ کا وقار ختم ہوگیا' امراء سازشوں میں مبتلا ہوکر خود غرضی اور ذاتی فوائد کے تحت اپنی وفاداریاں بدلنے لگے' خانہ جنگیوں اور بغاوتوں نے سلطنت کی جڑیں کھوکھلی کردیں' تو معاشرہ میں بے چینی' ابتری اور بدامنی پھیل گئی' اور جس قدر سیاسی ابتری پھیلتی گئی' اسی قدر ماضی شاندار ہوتا گیا' اور زوال کا احساس بڑھتا گیا۔

جب تک تاریخ میں شاہی خاندانوں کی حکومت رہی' اس وقت عروج و زوال کا تصور ان خاندانوں کی تاریخ سے وابستہ رہا' مثلاً" جب عباسی خاندان برسر اقتدار آیا اور اس نے فتوحات کے ذریعہ ایک بڑی سلطنت قائم کرلی' تو تاریخ میں ہارون الرشید اور مامون کے کارنامے زندہ جاوید ہوگئے۔ اور جب اس خاندان کو زوال ہوا تو اس سے

وابستہ تمام افراد اور جماعتیں متاثر ہوئیں۔ کیونکہ جب ایک سلطنت پھیل کر ٹوٹتی ہے تو اس کے اثرات معاشرے پر ہوتے ہیں۔ جب اس کی خاک سے نئے حکمران خاندان پیدا ہوتے ہیں تو وہ اپنے استحکام کے لئے سخت اقدامات کا سہارا لیتے ہیں اور اس عرصہ میں قدیم امراء برباد ہوجاتے ہیں اور نئے امراء وجود میں آتے ہیں۔ اس لئے ان قدیم خاندانوں میں زوال کے احساسات زیادہ شدت کے ساتھ ہوتے ہیں۔

عباسی زوال کے آخر میں خصوصیت سے منگولوں کے حملوں نے پوری اسلامی دنیا کو متاثر کیا۔ اور اس کے نتیجہ میں جو تباہی آئی' شہر لوٹے گئے' قتل عام ہوئے' لوگ گھر سے بے گھر ہوئے۔ کتب خانوں کو جلایا گیا' اور معاشرے کی ثقافتی روایات ختم ہوگئیں اس نے ذہنوں کو بری طرح متاثر کیا۔ شکست کے اس احساس نے زوال کی شدت کو ہر فرد تک پہنچا دیا۔

مگر جب صفوی' عثمانیوں اور مغلوں کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ تو ایک بار پھر تحفظ نے مسلمانوں میں عروج کا احساس پیدا کردیا' جو ان خاندانوں کے استحکام تک رہا۔ لیکن ان خاندانوں کے زوال کے بعد ہی مسلمان ملکوں میں پھر نہ تو کوئی ایسا خاندان ابھرا کہ جو دوبارہ سے مسلمانوں کو عروج کا احساس دلاتا' اور نہ ہی کسی ملک کو سیاسی استحکام نصیب ہوا کہ جو ان میں خود اعتمادی پیدا کرتا' اس کی وجہ یہ ہوئی کہ اس بار نہ صرف مسلمان ملکوں کو بلکہ ایشیا و افریقہ کے تمام ممالک کو یورپ کی طاقتوں سے واسطہ پڑا جو سائنسی و ٹیکنالوجی اور ذہنی صلاحیتوں کے ساتھ پوری قوت و توانائی سے ابھریں اور ایشیا و افریقہ میں اپنی نو آبادیات قائم کرلیں۔ اکثر مسلمان ممالک ان کے ہاتھوں شکست خوردہ ہوئے۔ اور انہوں نے یورپی تسلط کو قبول کرلیا' اس لئے ابھرتے ہوئے یورپ اور شکست خوردہ مسلمان ممالک میں عروج و زوال کے بارے میں نئے احساسات ابھرے۔

چنانچہ اس بار زوال کا احساس مختلف تھا' کیونکہ مسلمان ملکوں کو شکست دینے والی یورپی طاقتیں تھیں کہ جن کا وہ مقابلہ نہ کرسکے۔ لہٰذا اس بار جو عروج و زوال کے

درمیان مقابلہ کیا گیا وہ یورپ اور اسلامی ممالک کی حالت کا تھا۔ ابتداء میں تو شکست کی وجہ کو محض فوجی سمجھا گیا۔ اور یہ خیال کیا گیا کہ چونکہ یورپی ممالک فوجی اسلحہ' آلات حرب میں زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ان کی افواج میں زیادہ تنظیم ہے' اس لئے شکست کی وجہ یہ ہے۔ مگر جیسے جیسے یورپی اثرات بڑھتے گئے' انہیں یورپ اور اس کے معاشرے کے مطالعہ کا موقع ملتا چلا گیا' اور انہیں اس چیز کا احساس ہوتا چلا گیا کہ صرف فوجی لحاظ سے ہی نہیں بلکہ ذہنی لحاظ سے یورپ کے مقابلہ میں کم تر ہیں' خاص طور سے جب یورپ اور مسلمان ملکوں میں باہمی ربط بڑھے اور سیاحوں و سفیروں نے یورپ کے حالات دیکھنا شروع کئے تو انہیں دونوں معاشروں میں واضح تضاد نظر آیا' اور اس تضاد کی بنیاد پر انہوں نے اپنا موازنہ کرتے ہوئے خود کو پسماندہ اور یورپ کو ترقی یافتہ تسلیم کرلیا۔

سید احمد خان جنہوں نے انگلستان کا سفر کیا' اور وہاں کے معاشرے اور لوگوں کے بارے میں جو مشاہدات کئے' اور اہل یورپ کا مقابلہ ہندوستانیوں سے کیا تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ دونوں کی حالت میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

> "میں بلامبالغہ نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ تمام ہندوستانیوں کو اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک' امیر سے لے کر غریب تک' سوداگر سے لے کر اہل حرفہ تک' عالم فاضل سے لے کر جاہل تک' انگریزوں کی تعلیم و تربیت اور شائستگی کے مقابلہ میں در حقیقت ایسی ہی نسبت ہے جیسے لائق اور خوبصورت آدمی کے سامنے میلے کچیلے وحشی جانور کو۔ پس تم کسی جانور کو قابل تعظیم و لائق ادب سمجھتے ہو؟ کچھ اس کے ساتھ اخلاق و بداخلاقی کا خیال کرتے ہو؟ ہرگز نہیں کرتے۔ پس ہمارا کچھ حق نہیں ہے (اگرچہ وجہ ہے) کہ انگریز ہم ہندوستانیوں کو ہندوستان میں کیوں نہ وحشی جانور کی طرح سمجھیں۔

(سرسید : سفرنامہ انگلستان' مجلس ترقی ادب لاہور۔ ص ۱۸۳۔ ۱۸۴)

اہل مشرق نے اہل یورپ کے ملکوں اور اپنے ہاں جو فرق پایا وہ تھا ترتیب و تنظیم اور ڈسپلن کا' انہوں نے فوری طور پر اس فرق کو محسوس کیا کہ ان کے شہر ایک منصوبہ اور پلان کے تحت بنے ہوئے ہیں' وہاں باغات ہیں' میوزیم ہیں' تعلیمی ادارے ہیں' فرموں اور کمپنیوں کی عالیشان عمارتیں ہیں' صاف ستھری چوڑی سڑکیں' صفائی ' شور و غل اور ہنگامہ کا فقدان ہے' خاموشی اور مہذب انداز میں لوگوں کا ادھر ادھر آنا جانا ہے یہ ترتیب فوج سے لے کر طلبہ اور عوام تک میں تھی۔ چنانچہ ۶۸۔۱۸۶۷ء میں مصر سے علی مبارک پیرس گیا تو اس نے مشرق و مغرب کے درمیان اس تضاد کو محسوس کیا' اس کے مطابق اس کو شہر پیرس میں ہر چیز ایک ترتیب کے مطابق معلوم ہوئی۔ اس کی شاہراہوں پر تمام چلنے والے خاموش اور ڈسپلن کے ساتھ چل رہے تھے' اگرچہ سڑکوں پر لوگوں کا ہجوم تھا' مگر اس نے مصر کے برعکس کسی کو چیختے چلاتے نہیں دیکھا' اس کے برعکس ہر شخص اپنے کام سے کام رکھے ہوئے تھا' اور اس بات کا خیال رکھے ہوئے تھا کہ کسی دوسرے کو اس کی وجہ سے تکلیف نہ ہو۔ اگرچہ یہ لوگ ہر قسم کے بزنس میں مصروف تھے' مگر کہیں بھی لین دین پر نہ تو جھگڑا تھا اور نہ بحث' اس لئے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ لوگ شاید عبادت کے لئے جمع ہو گئے ہیں۔

علی مبارک کے خیال میں جو کچھ اس نے پیرس میں دیکھا یہ قاہرہ اور اسکندریہ کے بالکل برعکس تھا جہاں کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوتا ہے کہ لوگ ایک دوسرے کے معاملات میں دخل نہ دیتے ہوں۔ ایک دوسرے پر چیختے چلاتے نہ ہو اور گالم گلوچ نہ کرتے ہوں۔

(ٹی ۔ مچلز: کولونائیزنگ ا یجپٹ آکسفورڈ ۱۹۹۱ء ص ۔ ۶۴)

مارسیلز کے بارے میں سید احمد خان نے بھی اس فرق کو مارسیلز اور پیرس میں گھومتے ہوئے محسوس کیا۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

"تیسویں اپریل ۱۸۶۹ء میں بروز جمعہ کو ہم نے وہاں قیام کیا تاکہ ایسا خوبصورت شہر دن میں دیکھا جائے۔ ایک گاڑی دو گھوڑوں کی منگائی اور

قریباً" تمام شہر میں پھرے۔ اسی وسیع اور صاف اور خوبصورت اور ایسی ایسی عمدہ اور آراستہ دکانیں دیکھنے میں آئیں کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ بازاروں میں مٹی یا تنکے یا کوڑے کا نام تک نہ تھا' تمام عمارات نہایت صاف اور اجلی' زن و مرد نہایت صاف اور وضع دار اور ہر طرح کی خوبصورتی میں آراستہ نظر آتے۔"

(سرسید : ص ۱۵۰)

پیرس کے بارے میں سرسید کے خیالات کم و بیش وہی ہیں۔

"ایک ایک بازار اور ایک ایک مکان اور ایک ایک دکان تصویر کا عالم تھا' مکانوں پر اور بازاروں میں صفائی اس قدر تھی کہ ایک تنکا بھی پڑا نہیں دکھائی دیتا تھا۔ میلے کچیلے کا تو کیا ذکر ہے۔ جیسی صفائی ہم نے پیرس کے عام بازاروں میں دیکھی اس کو بیان کرنا لوگ مبالغہ سمجھیں گے۔"

چنانچہ جیسے جیسے مغرب کے بارے میں معلومات بڑھتی گئیں' اور اسلامی ملکوں میں نوآبادیاتی اقتدار مضبوط و مستحکم ہوتا رہا' اسی طرح سے مسلمان معاشرے خود کو زوال شدہ اور پسماندہ سمجھتے رہے' اور ان کے ذہنوں پر مغربی تہذیب و تمدن کی برتری مسلط ہوتی رہی' ان حالات میں پہلی مرتبہ اسلامی معاشروں نے یہ محسوس کیا کہ وہ ایک ایسی صورت حال میں ہیں کہ جو اس سے پہلے تاریخ میں انہیں درپیش نہیں آئی تھی۔ اگر منگولوں کے حملوں نے وسط ایشیا' ایران اور عباسی خلافت کو الٹ کر رکھ دیا تھا' مگر اس کے فوراً" بعد ہی انہوں نے سنبھالا لیا' اور خود کو سیاسی بحران سے بچا لیا' صلیبی جنگوں نے ایک محدود حد تک سیاسی اثرات ڈالے' مگر اس سے بھی وہ جلد ہی آزاد ہوگئے' مگر اس مرتبہ یورپ کا تسلط صرف سیاسی ہی نہیں تھا بلکہ یہ ذہنی و تہذیبی اور تمدنی بھی تھا' اس لئے مسلمان ملکوں نے خود کو اس کے آگے بڑا مجبور اور بے بس پایا۔ فوجی شکستوں نے ان کے حوصلوں کو ختم کر کے رکھ دیا تھا۔ نئے خیالات و افکار نے ان کی روایات و قدروں کو پامال کرنا شروع کردیا' لہٰذا ان حالات میں اول تو ضرورت اس بات

کی تھی کہ اس کا تعین کیا جائے کہ یہ زوال کیوں آیا؟ وہ کون سی وجوہات تھیں کہ جنہوں نے ان کو فوجی طاقت اور تہذیبی روایات کو ختم کر کے انہیں اس قابل نہیں چھوڑا کہ وہ اپنا دفاع کر سکیں۔ زوال کے اس عمل کو مختلف طبقہ فکر کے لوگوں نے اپنے اپنے انداز اور نقطہ نظر سے دیکھا اور اس کا تجزیہ کیا۔ اور اس تجزیہ کی روشنی میں انہوں نے اس کا حل تلاش کیا۔

زوال کے بدلتے تصورات

ہندوستان میں اورنگزیب کے مرنے کے بعد جو سیاسی انتشار ہوا' اور اس کے نتیجہ میں خانہ جنگیاں' انتظامیہ کی ٹوٹ پھوٹ' اور امراء کی سازشیں اور مرکزی حکومت کی کمزوری پیدا ہوئی تو ایک تاثر یہ ابھرا کہ ہندوستانی معاشرہ زوال پذیر ہے' اس زوال کی علامات یہ نظر آئیں کہ بادشاہ و امراء کی شان و شوکت کم ہوگئ' شاہی عمارات پر کہنگی کے آثار نظر آنے لگے۔ شعراء و علماء اور اہل فن کی سرپرستی ختم ہوگئ' اس لئے اس دور کے دانشوروں نے اس صورت حال سے یہ اندازہ لگایا کہ اس زوال نے لوگوں کے کردار اور اخلاق کو تباہ کردیا ہے۔ بہادری اور شجاعت و سپہ گری کی جگہ ان میں کم ہمتی اور بزدلی پیدا ہوگئ۔ وسعت نظر کی بجائے تنگ نظری آگئ ہے' اور لوگوں کی اخلاقی قدریں بدل گئی ہیں۔ اس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ عروج کے زمانہ میں معاشرہ اعلیٰ کردار پیدا کرتا ہے' کہ جب بدعنوانی اور برائیوں سے محفوظ لوگ ہوتے ہیں' مگر زوال کے زمانہ میں یہ کردار پست ہوجاتے ہیں۔ اور ان میں اخلاقی برائیاں سرائیت کرجاتی ہیں عروج کے زمانہ میں کردار کی سادگی زوال کے عہد میں عیاشی' سہل پسندی اور آرام طلبی میں بدل جاتی ہے' چنانچہ اس پہلو کی جانب اٹھارویں صدی کے مشہور عالم شاہ ولی اللہ نے اس طرح اشارہ کیا۔

> "تاریخ شاید ہے کہ اہل روما اور اہل فارس کی ایران میں ایک لمبی مدت تک حکومت رہی۔ انہوں نے اپنے دور کے حالات کے مطابق تمدن کے لوازم اور رفاہیت (آرام پسندی) اور عیاشانہ زندگی میں غیر معمولی ترقی کی۔

آخرت کی یاد کو پس پشت ڈال کر اپنی دنیوی زندگی کو عیاشی کے ساتھ بسر کرنا اپنا نصب العین قرار دیا۔ اور شیطان نے ان پر اپنا پورا تسلط جما لیا۔ تمام امراء اور سرمایہ دار عیش پرستی میں منہمک تھے اور اس بارے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے میں کوشاں رہتے تھے سرمایہ دار اور امراء کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ اس کے پاس ایک شاندار محل ہو' جس کے صحن کے سامنے باغ ہو' حمام جیسے لوازم اس میں موجود ہوں' اس کے دستر خوان پر الوان نعمت چنے جائیں' اور اس کی زرق برق پوشاک سب لوگوں میں نمایاں ہو' نیز اس کے پاس عمدہ نسل کے گھوڑوں اور راحت بخش گاڑیوں کی کمی نہ ہو' اور خدمت کے لئے لونڈیاں اور کمربستہ غلام حاضر باش رہا کریں۔"

(حجتہ اللہ بالغہ ' بحوالہ : سماجی انصاف و اجتماعیت' غلام مصطفیٰ قاسمی' حیدر آباد ۱۹۷۳ء ۔ ص ۔ ۷)

شاہ ولی اللہ اپنے عہد میں مغلیہ حکومت کی کمزوریوں اور زوال کے بارے میں خیال ظاہر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ :

اور اس دور میں حکومتوں کی بربادی کا غالب سبب دو باتیں ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ بیت المال (خزانے) پر مفت خوروں نے بوجھ ڈال دیا ہے۔ بعض ان میں سے اپنے آپ کو غازی اور مجاہد سمجھ کر بیت المال سے مال اڑانے کے عادی ہوگئے ہیں اور بعض اپنے آپ کو علماء کی حیثیت سے خزانے کا مستحق جانتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کو انعام و اکرام سے نوازنا اور ان کو بخشش اور صلہ دینا سرمایہ داروں کی عادت ہوتی ہے جیسے زاہد اور درباری شعراء' بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو بھکاری کہنا مناسب ہے' ان کا مقصد صرف مال جمع کرنا' اور اپنا پیٹ بھرنا ہوتا ہے اس سے قطع نظر کہ معاشرہ کی ضرورت اور مصلحت ان سے پوری ہوتی ہے یا نہیں ہوتی ہو۔ اس کے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک جماعت دوسری جماعت کا مقابلہ کرتی ہے اور پھر

آپس میں ایک دوسرے کے لئے معاشی ناہمواری کا باعث بنتی ہے اور آخر میں یہ لوگ معاشرہ پر بوجھ بن جاتے ہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ کسان' تاجر اور صنعت کار پر حکومت نے بھاری ٹیکس لگا رکھے ہیں اور ان کے وصول کرنے میں ان پر سختی و تشدد روا رکھتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ حکومت کا وفادار طبقہ بھی ان ٹیکس کے بوجھ تلے دبتا اور پیچھے ہٹتا جارہا ہے۔ اور دوسری طرف ایک اور فریق ہے۔ اس نے اس ناجائز تشدد سے تنگ آکر بغاوت کی راہ اختیار کی ہے۔

(ایضا: ص ۔ ۳۹ ۔ ۴۰)

مذہبی نقطہ نظر سے جب بھی علماء نے مسلمانوں کے زوال کا تجزیہ کیا ہے تو انہوں نے اس کے اسباب میں سرفہرست مذہب سے دوری اور بیگانگی کو قرار دیا ہے جس کے نتیجہ میں معاشرہ اخلاقی بے راہ روی اور گناہوں کی دلدل میں پھنس جاتا ہے' اور بالاخر ان پر خدا کا قہر آتا ہے'اور وہ تباہ و برباد ہوجاتے ہیں' خدا کا یہ قہر سیلاب' قحط ' خشک سالی اور حملہ آوروں کی شکل میں آتا ہے۔ ان کے نزدیک اس کا ایک ہی حل ہے کہ وہ یہ کہ مذہب کی تعلیمات پر عمل کیا جائے۔ تو اس صورت میں معاشرہ پھر سے پاک و صاف ہوکر عروج و ترقی کی راہ پر گامزن ہوجائے گا۔

سیاسی نقطہ نظر سے جن دانشوروں نے اٹھارویں صدی میں ہندوستان کے مسلمان معاشرے کا تجزیہ کیا تو اس میں کمزور اور نااہل بادشاہ' اس کے سازشی امراء' حکمران طبقوں کا شراب و عورتوں کا رسیا ہونا' اور فوجی طاقت میں کمی زوال کے اہم اسباب تھے۔

جب ۱۸۵۷ء میں ہندوستان سے مغل بادشاہت کا خاتمہ ہوا تو اس نے طبقہ اشرافیہ کو خصوصیت سے اور عام مسلمانوں کو عمومی حیثیت سے بڑا متاثر کیا' انہوں نے نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کی لوٹ مار اور تباہ کاریوں کو سہ لیا تھا۔ وہ مرہٹوں' جاٹوں رہیلوں اور سکھوں کی بغاوت کو بھی برداشت کرگئے تھے۔ انہوں نے اودھ کی سلطنت کے

خاتمہ کا صدمہ بھی اٹھا لیا تھا مگر مغل بادشاہت کے خاتمہ سے ان کی سیاسی اقتدار کی علامت کا خاتمہ ان کے لئے ایک ناقابل برداشت صدمہ تھا۔

اور یہی وجہ تھی کہ پہلی مرتبہ مسلمان دانشوروں نے اپنے معاشرہ کے زوال کا تجزیہ کیا' اور یہ تجزیہ اس مرتبہ تنقیدی تھا' اس کی سب سے عمدہ مثال حالی کی "مسدس مدوجزرِاسلام" ہے۔ اس مسدس کو لکھوانے میں حالی کو جس صورت حال نے اکسایا وہ مسلمان معاشرہ کی ابتری تھی۔ بقول ان کے

"قوم کی حالت تباہ ہے۔ عزیز ذلیل ہوگئے ہیں۔ شریف خاک میں مل گئے۔ علم کا خاتمہ ہوچکا ہے' دین کا صرف نام باقی ہے۔ افلاس کی گھر گھر پکار ہے۔ پیٹ کی چاروں طرف دھائی ہے' اخلاق بالکل بگڑ گئے ہیں رسم و رواج کی بیڑی ایک ایک کے پاؤں میں پڑی ہے۔ جہالت و تقلید سب کی گردن پر سوار ہے۔ امراء جو قوم کو بہت کچھ فائدہ پہنچاسکتے ہیں غافل اور بے پرواہ ہیں۔ علماء جن کو قوم کی اصلاح میں بہت بڑا دخل ہے زمانہ کی ضرورتوں اور مصلحتوں سے ناواقف ہیں۔

(مسدس حالی لاہور (؟) پہلا دیباچہ ص ۴)

حالی نے مسدس میں عرب میں اسلام سے پہلے دور جاہلیت کا نقشہ کھینچتا ہے کہ معاشرہ میں تمام اخلاقی برائیاں موجود تھیں' مگر اسلام کی آمد کے ساتھ ہی ان کی حالت بدلتی ہے' اور عرب کے یہ بدو فاتح کی صورت میں شام و ایران کی بڑی سلطنتوں کو فتح کرتے ہیں' اور ایک عظیم سلطنت کی بنیاد کے ساتھ ہی ان کے ہاں تہذیب و ثقافت کی ابتداء ہوتی ہے اور انہوں نے دنیا کو علم و فن سے روشناس کرایا' اپنی اس عظیم تہذیب کی یادگاریں نہ صرف علم و ادب و فن میں چھوڑیں بلکہ عالیشان عمارات و شاندار شاہرائیں آج بھی ان کی یاد دلاتی ہیں مگر پھر اس عروج کے بعد زوال آتا ہے' اور ان کی تمام خوبیاں ایک ایک کرکے رخصت ہوتی ہیں' اور وہ دوبارہ سے پھر اسی دور جاہلیت میں آجاتے ہیں آخر بسلمان کس طرح سے اس پس ماندگی سے نکلیں۔ حالی

کے ہاں اس کا جواب بھی ہے' اور وہ یہ کہ زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کے تحت خود کو ڈھالنا چاہیے' اور جدید تعلیم سے خود کو آراستہ کرنا چاہئے' کیونکہ جدید تعلیم ہی کے ذریعہ تجارت' صنعت و حرفت اور ہنر و فن میں ترقی کرسکتے ہیں۔

حالی کی اس مسدس کا اثر ہندوستان کے مسلمانوں پر جذباتی طور پر تو بڑا ہوا' جس کا ذکر حالی نے دیباچہ دوم میں کیا ہے۔

"چھ برس میں جس قدر مقبولیت و شہرت اس نظم کو اطراف ہندوستان میں ہوئی' وہ فی الواقع تعجب انگیز ہے' نظم بالکل غیرمانوس تھی اور مضمون اکثر طعن و ملامت پر مشتمل تھے' قوم کی برائیاں چن چن کر ظاہر کی گئیں تھیں اور زبان سے تیغ و سنان کا کام لیا گیا تھا..... بایں ہمہ اس تھوڑی سی مدت میں یہ نظم ملک کے اطرف و جوانب میں پھیل گئی۔

حالی پر امید ہو کر کہتے ہیں کہ :

اس نے ایک ایسی جماعت کو مخاطب گردانا ہے جو بے راہ ہے پر گمراہ نہیں ہے۔ وہ رستے سے بھٹکے ہوئے ہیں' مگر راستے کی تلاش میں چپ و راست نگراں ہیں' ان کے ہنر مفقود ہوگئے ہیں مگر قابلیت موجود ہے' ان کی صورت بدل گئی ہے' مگر ہیولی باقی ہے' ان کے قویٰ مضمحل ہوگئے ہیں مگر زائل نہیں ہوئے' ان کے جوہر مٹ گئے ہیں مگر جلد سے پھر نمودار ہوسکتے ہیں۔ ان کے عیبوں میں خوبیاں بھی ہیں مگر چھپی ہوئی' ان کے خاکستر چنگاریاں بھی ہیں مگر دبی ہوئی۔

(مسدس حالی ص ۔ ۷ ۔ ۸)

برطانوی دور حکومت میں اس پسماندگی اور تنزلی سے نکلنے کے لئے دو راستوں کو اختیار کیا گیا:

اسلام کا ترقی پسند نظریہ کہ جس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ جدید یورپی تہذیب اور اس کے اداروں اور روایات کو اختیار کیا جائے کیونکہ یہ اسلام سے متضاد نہیں اور

موجودہ دور میں ترقی اس ذریعہ سے ممکن ہے۔ دوسرا نقطہ یہ تھا کہ یورپی تہذیب کو مکمل طور سے رد کیا جائے اور اسلام کا احیاء کیا جائے کیوکہ اس میں ترقی اور نجات ہے۔ یہ دونوں نظریات مذہبی تھے' اور مذہبی روایات میں راستہ ڈھونڈنا چاہتے تھے' ان کے برعکس کوئی سیکولر نظریہ پیش نہیں کیا گیا' اور نہ ہی مذہب سے ہٹ کر کوئی متبادل نظام تشکیل دیا گیا۔ اس وجہ سے برطانوی دور میں مسلمان معاشرہ جس قدر اصلاحی تحریکیں اٹھیں' وہ تمام کی تمام مذہبی تھیں۔

ایک خاص بات ان تحریکوں کی یہ تھی کہ وہ معاشرہ کو بغیر حکومت کی مدد کے اندرونی طور پر ٹھیک کرنا چاہتی تھیں' آگے چل کر وہ راہنما بھی کہ جنھوں نے قومیت کی بنیاد پر سیاست کی' ان کا دائرہ کار بھی مذہبی تھا' اس لئے ہندوستان میں مسلمان معاشرے کی پسماندگی اور تنزلی کی جب بھی بات ہوئی تو اس میں مذہبی عنصر ہمیشہ غالب آیا۔ اور اس بات کو سب ہی نے دھرایا کہ اگر معاشرہ میں اسلامی تعلیمات کا رواج ہوجائے تو یہ پسماندگی دور ہوسکتی ہے' اور یہی وہ مذہبی عنصر تھا کہ جس نے برصغیر کی تقسیم میں اہم کردار ادا کیا' کیونکہ ہندوستان میں رہتے ہوئے کہ جہاں ہندو اکثریت تھی' اسلامی تعلیمات کا نفاذ ممکن نہیں تھا' اس کے لئے علیحدہ معاشرہ کی ضرورت تھی۔ اس نظریہ پر پاکستان کی تشکیل ہوئی۔

○

اصلاحات اور احیاء

پس ماندہ اور تنزل شدہ معاشرے میں بنیادی خرابیوں اور برائیوں کو دور کرنے کے لئے دو راستوں کو اختیار کیا جاتا ہے' ایک تو یہ کہ سیاسی و معاشی' اور سماجی اصلاحات کی جائیں تاکہ معاشرہ سدھر سکے' اس کی مثال اکثر مفکرین اور دانشوروں نے جسم سے دی ہے کہ اگر جسم میں خرابی پیدا ہوجائے تو اس کا علاج کرنا چاہیے تاکہ وہ صحت مند ہوسکے' اگر جسم کاکوئی حصہ ناکارہ ہوجائے تو اسے علیحدہ کردینا چاہیے تاکہ وہ جسم کے دوسرے حصوں اور اعضا کو متاثر نہیں کرے۔ اس طرح ہمارے معاشرے کو اصلاحات کی دوا سے ٹھیک کرنے کا رویہ پیدا ہوا۔

خاص طور سے جب مسلمان ملکوں کے تعلقات یورپ سے ہوئے تو انہوں نے اول یہ محسوس کیا کہ یورپ کی برتری اس کی فوجی صلاحیتوں پر ہے' اس لئے ابتداء میں ترکی اور مصر میں فوجی اصلاحات کی گئیں' اور اکثر اسی مقصد کے لئے یورپ سے فوجی افسروں کو تربیت کے لئے بلایا گیا' اس کے بعد محسوس کیا کہ فوجی اصلاحات سے زیادہ دستوری اصلاحات ہیں' چنانچہ ترکی' ایران' مصر میں دستوری اصلاحات کا زمانہ آیا' پھر یہ احساس ہوا کہ یورپی تعلیم اور خصوصیت سے سائنس کی تعلیم ان کی پسماندگی کو دور کرے گی۔ اس لئے تعلیمی اصلاحات شروع ہوئیں۔

مگر یہ تمام اصلاحات جو وقتاً" فوقتاً" ان ملکوں میں ہوئیں۔ یہ نہ تو ان کی پس ماندگی کو دور کرسکیں' اور نہ ہی معاشرے کو تبدیل کرسکیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ اصلاحات کسی نہ کسی طبقے اور گروہ کے مفادات سے ٹکراتی تھیں' اور وہ اس کی اس

قدر شدت سے مخالفت کرتے تھے کہ اس کی ناکامی یقینی ہوجاتی تھی۔

اصلاحات کے پس منظر میں جو تاریخی عمل کام کرتا ہے وہ یہ کہ جب بھی معاشرہ تبدیلی کے مرحلے پر ہو' اور یہ تبدیلی آبادی کے بڑھنے' صنعت و حرفت کی ترقی یا زراعتی پیدواری طریقوں اور ٹیکنالوجی کی وجہ سے ہو' یا سیاسی وجوہات کی بناء پر یا ذہنی و فلسفیانہ نظریات کی وجہ سے' اس لمحہ کو محسوس کرکے اس وقت قدیم اداروں اور روایات کو ان کے مطابق ڈھالا جائے' اگر یہ وقت گذر جاتا ہے تو معاشرہ اس درجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ جہاں اصلاحات کے ذریعہ تبدیلی ممکن نہیں رہتی ہے۔

اس سلسلہ میں برطانیہ کی مثال دی جاسکتی ہے کہ جس کے ہاں اصلاحات کا ایک تسلسل ہے' ہر اس مرحلہ پر جب کہ تبدیلی ناگزیر ہوجاتی ہیں تو وہاں اصلاحات کے ذریعہ اداروں کو بدل دیا جاتا ہے' لیکن اس کے مقابلہ میں فرانس کی مثال ہے کہ جہاں معاشرہ کو فرسودہ اداروں کو اس وقت تک باقی رکھاگیا کہ وہ اپنی افادیت کھو بیٹھے اور ان میں اصلاحات کی گنجائش نہیں رہی اس لئے جب انقلاب سے پہلے اصلاحات کی کوششیں کی گئیں' یا انقلاب کی ابتدائی دنوں میں تبدیلیاں لائی گئیں تو وہ سب کی سب بیکار ہوئیں' اور بالاخر تبدیلی کا آخری حل انقلاب ثابت ہوا۔ اور یہی کچھ روس میں بالشوک انقلاب سے پہلے ہوا۔ اس لئے اصلاحات ایک مسلسل عمل ہے' اگر اس میں ٹھہراؤ آجائے گا تو اس کے نتیجہ میں اصلاح کا کام مشکل ہوجائے گا۔

لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ اگر اصلاحات کے راستے بند ہوجائیں تو انقلاب ضرور آتا ہے کیونکہ انقلاب کے لئے معاشرہ میں ذہنی و فکری بنیادوں کا ہوناضروری ہوتا ہے اگر یہ بنیادیں نہ ہوں تو اس صورت میں معاشرے میں بدامنی اور ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے' اور یہ ٹوٹ پھوٹ ایک طویل عرصہ تک جاری رہ سکتی ہے اور اس کے نتیجہ میں معاشرہ مستقل طور پر پسماندگی کی حالت میں رہتا ہے۔

معاشرے کو تنزلی سے نکالنے کے لئے دوسرا راستہ احیاء دین کا ہے' موجودہ دور میں یورپی اقوام کی نو آبادیاتی پالیسی کے خلاف اس کو سوڈان میں مہدی سوڈانی' اور لیبیا

میں شیخ سنوسی نے اختیار کیا۔ حجاز میں عبدالوہاب نے اس کے ذریعہ مشرکانہ رسومات کو ختم کرنے کی کوشش کی' اور آج تقریباً" تمام مسلمان ملکوں میں احیاء یا بنیاد پرستی کی تحریکیں مغرب کی ثقافتی یلغار اور حکمران سیکولر طبقوں کے خلاف اس کو استعمال کر رہی ہیں یورپ میں بھی اس تحریک کو جدید تہذیب کے خلاف رد عمل سمجھا جارہا ہے اور اسلئے اسے وہ اپنے دشمن کے روپ میں دیکھ رہے ہیں۔ سعودی عرب کو جہاں احیاء کے ماڈل کو نافذ کیا گیا ہے اس کی اقتصادی خوش حالی کا دارومدار اس کی تیل کی دولت پر ہے مگر فکری و ذہنی لحاظ سے اس کا معاشرہ انتہائی پسماندہ ہے سعودی اور شاہی خاندان وہابی عقائد کے تحت اپنی بادشاہت کو مضبوط رکھے ہوئے ہیں۔

احیاء کی یہ تحریکیں' یا بنیاد پرستی اس لئے کامیاب نہیں ہوسکے گی کہ اس کے ہاں تبدیلی کے عمل کو سمجھنے اور اس کے ساتھ ہی اداروں اور روایات کو تبدیل کرنے کا کوئی تصور نہیں ہے' اس کی مقبولیت کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان معاشروں میں حکمران طبقوں نے تمام مراعات اور دولت پر قبضہ کرکے اپنا اقتدار قائم کرلیا ہے' اور معاشرے کے محروم طبقے کسی دوسرے نعم البدل نہ ہونے کی وجہ سے بنیاد پرست جماعتوں میں جارہے ہیں' اوران کے ذریعہ وہ تشدد اور انتہاء پسندی کے ذریعہ اپنی محرومیوں کا انتقام لے رہے ہیں۔

اسلامی معاشروں کے علاوہ اور بہت سے ایشیا و افریقی ملکوں میں قومی اداروں اور روایات کے احیاء کی بات ہورہی ہے' مثلاً" یہ کہ یورپی طرز کی جمہوریت کو کیوں اختیار کیا جائے' ہندوستان کی قدیم پنچایتی نظام کو کیوں نہ نافذ کی جائے یورپی طب کے ذریعہ ہی کیوں بیماریوں کا علاج کیا جائے' آریوویدک یا قدیم چینی طریقہ علاج کا کیوں نہ احیاء کیا جائے؟ لہٰذا یورپی تسلط سے خود کو آزاد کرنے کے لئے چین میں دوبارہ سے کنفیوشس کی تعلیمات کا احیاء ہورہا ہے تو ہندوستان میں بھی قدیم روایات و اداروں کو دوبارہ سے نئی زندگی بخشنے کی بات ہورہی ہے۔

قومی روایات و اداروں کے احیاء کے اس عمل میں بہت زیادہ محتاط ہونے کی

ضرورت ہے۔ کیونکہ تمام قدیم ادارے اور روایات ترقی پسند اور جدید زمانہ سے مطابقت نہیں رکھتی ہیں۔ ہندوستان میں عورت کا معاشرہ میں جو پست مقام ہے' اور ذات پات کا جو رواج ہے کیا آج کے دور میں اس کے احیاء سے ترقی ہو سکتی ہے؟ اس لئے اس احیاء کی بات کرنے سے قدامت پرستوں کو ایک نئی زندگی مل جائے گی' اور اس سے زیادہ فائدہ بنیاد پرست جماعتیں ہی اٹھائیں گی۔

مسلمان ملکوں میں تیسرا ماڈل ترکی کا ہے' پہلی جنگ عظیم کے بعد مصطفیٰ کمال اتا ترک نے ترکی معاشرے کو مشرقی روایات سے نکال کر اسے یورپی بنانے کی کوشش کی اور اس بات کی کوشش کی کہ قدیم روایات اور تاریخی تسلسل سے ترکی کو بالکل آزاد کرکے نئے سرے سے اس کی شناخت قائم کرے اس کی یہ اصلاحات اوپر سے تھیں' اور نیچے سے اس نے لوگوں کو اس عمل کے لئے تیار نہیں کیا' مگر تاریخ میں اصلاحات کا یہ عمل دونوں طرح ہی سے رہا' مثلاً" فرانسیسی انقلاب کے بعد جرمنی کو پسماندگی سے نکالنے کے لئے پروشیا کی حکومت' اس کے عہدے دار' اور جرمن دانشور تھے کہ جنہوں نے حکومتی ذرائع کو استعمال کرکے معاشرے کو بدلا اتا ترک نے ترکی کو یورپی بنانے کی کوشش کی اور اس میں وہ ایک حد تک کامیاب بھی ہوا' اور آج ترکی دوسرے مسلمان ملکوں کے مقابلہ میں بہتر حالت میں بھی ہے' اگر اتا ترک کے بعد اس کے عمل کو باقی رکھا جاتا' اور مسلسل تبدیلی کے ذریعہ اداروں کو بدلا جاتا رہا تو اس کی ترقی یقیناً" ہوتی مگر یہ عمل حکمران طبقوں اور خصوصیت سے فوج کے عمل و دخل کی وجہ سے جاری نہ رہ سکا اور جیسے جیسے وہاں طبقاتی تضادات بڑھ رہے ہیں اسی طرح سے محروم' طبقے اپنے مسائل کے حل کے لئے بنیاد پرست جماعتوں کی طرف دیکھ رہے ہیں' اور یہ ترکی کے حکمرانوں اور وہاں کے دانشوروں پر ہے کہ وہ بدلتے ہوئے حالات کے تحت اپنے اوارں کو بدلیں' کیونکہ اب جو جمہوری روایات کے تحت لوگوں میں شعور آیا ہے تو وہ اپنے حقوق کی بات کرتے ہیں' اگر ان کے یہ حقوق دستوری اور قانونی طریقوں سے انہیں نہیں دیئے گئے تو وہ پھر تشدد کی راہ اختیار کریں گے اس لئے

یہ مسئلہ ترکی کا نہیں تمام مسلمان ملکوں کا ہے کہ جہاں عوام کے نام پر حکومت کرنے والے سب سے زیادہ عوام کا استحصال کر رہے ہیں۔

اس لئے ان ملکوں کا پسماندگی سے نکلنے کا جو راستہ ہے وہ یہ کہ مراعاتی اور طبقاتی نظام کو بدل کر عوام کو ان کے حقوق دے کر ان کی توانائی سے معاشرے کی تعمیر کریں' ورنہ معاشرہ کا انتشار اور ٹوٹ پھوٹ سب ہی طبقوں کو اپنے بہاؤ میں بہا کر لے جائے گا۔

پاکستانی معاشرہ اور پس ماندگی

کیا پاکستانی معاشرہ پسماندگی کے مرحلے میں ہے' یا وہ تنزل پذیر ہو رہا ہے؟ اکثر یہ سوال لوگوں کے ذہن میں آتا ہے' اور یہ سوال اس وقت ابھرتا ہے کہ جب لوگ اپنی روزمرہ کی زندگی میں مسائل سے دوچار ہوتے ہیں یہ وہ مسائل ہیں کہ جو زندگی کے معیار کو بہتر بناتے ہیں' یا اسے ناقابل برداشت کردیتے ہیں' اور اس پیمانے پر کسی معاشرے کے اچھے یا برے ہونے کے بارے میں فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

پس ماندہ یا زوال پذیر معاشروں میں ایسے لوگوں کی کافی تعداد ہوتی ہے جو کہ مرض کی صحیح تشخیص کرکے اس کی دوا تجویز کرسکتے ہیں لیکن حیرت کی بات یہ ہوتی ہے کہ ان کے دانشمندانہ اقوال کا کوئی اثر نہیں ہوتا ہے' اور معاشرہ اسی طرح سے پسماندگی میں گرتا چلا جاتا ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ پسماندگی کی کوئی انتہاء نہیں ہوتی ہے معاشرے اس کی گہرائی میں گرتے چلے جاتے ہیں۔

اور یہ سوال بھی ذہن میں آتا ہے کہ کیا جب کوئی معاشرہ ایک مرتبہ پسماندہ ہوجائے تو کیا وہ ہمیشہ اسی حالت میں رہتا ہے یا اسے اس دلدل سے نکلنے کا کوئی راستہ مل جاتا ہے؟ کسی بھی معاشرے کے پسماندہ ہونے کے بعد دوبارہ سے ابھرنے کے امکانات بہت کم ہوتے ہیں' کیونکہ پسماندہ معاشروں میں جو ذہین اور باصلاحیت افراد ہوتے ہیں' یا جو پیشہ ور لوگ ہوتے ہیں' ان کے لئے اس معاشرہ میں کوئی جگہ باقی نہیں رہتی ہے' اس لئے وہ ان معاشروں میں اپنی جگہ ڈھونڈتے ہیں کہ جہاں وہ اپنی ذہانت اور تخلیقی صلاحیتوں کو استعمال کرسکیں' چنانچہ تیسری دنیا کے ملکوں سے آج

سائنس دان، اساتذہ اور ٹیکنالوجی کے ماہرین مغرب کے ترقی یافتہ ملکوں میں جارہے ہیں کہ جہاں ان کی ضرورت ہے، اور جہاں وہ اپنی ذہانت کو استعمال کرسکتے ہیں، اس کی وجہ سے ترقی شدہ اور زوال پذیر یا پسماندہ معاشرے میں فرق بڑھتا جارہا ہے، اس صورت حال میں ہیں پس ماندہ ملکوں کے لئے اس صورت حال سے نکلنا مشکل ہوگیا ہے۔

موجودہ زمانے میں ایک مثال چین کی ہے۔ کہ جو زوال پذیر ہوکر انتہائی پس ماندہ ہوگیا تھا، مگر وہاں قوم پرستی کی تحریک نے اول اسے نو آبادیاتی استحصال سے آزاد کرایا اور اس کے بعد کمیونسٹ تحریک نے وہاں ایک نئے دور کو شروع کیا تو اسے پسماندگی سے نکال کر باوقار قوموں کی صف میں لاکھڑا کیا۔

کیا پاکستان کے لئے پسماندگی سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ پسماندگی ہماری روایات اور سماجی و سیاسی اور اقتصادی اداروں میں اس قدر سرایت کرچکی ہے کہ اب ان میں اصلاح کرنا ناممکن ہے، کیونکہ اصلاح کے لئے مصلحین کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اور ذہنی طور پر معاشرے کی آمادگی کی بھی، ان دونوں چیزوں کی ہمارے ہاں کمی ہے، دوسرا راستہ انقلاب کا ہے، جو اس پورے نظام کو الٹ کر یہاں نئے اداروں کی تشکیل کرے، مگر اس عمل کے لئے بھی نہ تو دانشوری کی روایات ہیں، اور نہ ہی تخلیقی صلاحیت والے افراد، اس لئے ان دونوں صورتوں کے عمل پذیر نہ ہونے کی وجہ سے خطرہ اس بات کا ہے کہ پاکستانی معاشرہ پسماندہ حالت میں ہی رہے گا اور کب تک اس کی یہ حالت رہے گی، اس کے بارے میں کوئی پیش گوئی نہیں کی جاسکتی ہے۔ یہ صورت حال اس وقت اور بھی مایوس کن ہوجاتی ہے کہ جب پاکستانی دانشوروں کی ذہنی پسماندگی سامنے آتی ہے، جو حالات کا تجزیہ کرنے سے قاصر ہیں اور جب وہ اس بیماری کی تشخیص ہی نہیں کرسکتے تو اس کا علاج بھی دریافت نہیں کرسکے ہیں۔ کسی بھی معاشرے کو پسماندگی سے نکالنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے دانشور پس ماندگی کا تجزیہ کریں، فرسودہ روایات اور اداروں کی جگہ نئے ڈھانچہ اور نظام کی تشکیل کریں، تاکہ ان افکار کی روشنی میں سیاسی راہنما اپنا لائحہ عمل بناسکیں۔ ہمارا

مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ پاکستانی دانشور اس وقت خود پسماندگی کا شکار ہیں۔ اس لئے ایسے امکانات نظر نہیں آتے کہ یہ فکر و آگہی کی نئی راہیں تلاش کرکے معاشرے کو پسماندگی سے نکال سکیں گے۔

حصہ سوم

مضامین

علم آثار قدیمہ

انسان کو قدیم اور پرانی چیزوں سے دلچسپی تو ہمیشہ سے رہی ہے' مگر ابتداء میں وہ ان چیزوں کو اس لئے محفوظ کرکے رکھتا تھا کہ ان سے یا تو اسے خاندانی طور پر لگاؤ ہوتا تھا اور یہ اس کے آباؤ اجداد کی یادگاریں ہوتی تھیں کہ جنہیں حفاظت سے رکھ کر اپنے آباؤ اجداد سے اپنا رشتہ قائم رکھتا تھا۔ دوسری صورت میں بزرگوں ' اولیاؤں اور صوفیاؤں کے تبرکات ہوتے تھے کہ جنہیں برکت کے طور پر محفوظ رکھا جاتا تھا لیکن ابتداء میں اسے ان کی تاریخی اہمیت کا احساس نہیں تھا اور وہ یہ اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ ان قدیم اشیاء میں تاریخ محفوظ ہے یہ خاندانی اور روحانی تعلق نہیں ہوتا تھا تو اس صورت میں قدیم اشیاء اس کے لئے محض بے جان چیزیں ہوتی تھیں کہ جن کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی تھی۔

جب وہ پرانے کھنڈرات و آثار کو دیکھتا تھا تو اسے یہ احساس ضرور ہوتا تھا کہ یہ قدیم قوموں اور انسانوں کی بنائی ہوئی عمارات و بستیاں ہیں کہ جو وقت کے ہاتھوں اجڑ گئی ہیں مگر اس کی یہ کوشش نہیں ہوتی تھی کہ وہ ان بستیوں اور ان آثار سے پچھلی قوموں کی زندگی اور ان کی تاریخ کے بارے میں کچھ سیکھے۔

اکثر ایسا بھی ہوا کہ فاتح قوموں نے مفتوح قوموں کے قدیم آثاروں کو اور زیادہ تباہ و برباد کردیا۔ عباسیوں کے زمانہ میں اس بات کی کوشش ہوئی کہ طاق کسریٰ کو تباہ و برباد کردیا جائے مگر اس کام میں اتنا وقت اور قوت صرف ہوئی کہ اسے ابتدائی مرحلوں کے بعد چھوڑ دیا۔ مصر میں ابوالہول کے مجسمہ کو مسخ کرنا بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی

ہے بتوں اور مجسموں کو توڑنا یا ان کی صورتوں کو بگاڑنا بھی تاریخ میں عام رہا ہے۔

یہ تو خیر اس زمانہ کی بات ہے کہ جب انسان قدیم آثار کی اہمیت سے واقف نہیں تھا لیکن جب اسے اس کا علم ہوا تو اس کے نتیجہ میں اور زیادہ تباہی آئی۔ نپولین نے اٹلی کی فتح کے بعد وہاں سے نادر اشیاء کو فرانس بھجوا دیا اور جب وہ مصر کی فتح کے لئے آیا تو اس کے ہمراہ عالموں کی ایک نئی ٹیم تھی جنہوں نے مصر کی قیمتی اور نادر یادگاروں کو چن چن کر فرانس روانہ کیا۔ اس کے بعد نو آبادیاتی دور میں جو لوٹ کھسوٹ ہوئی اس کو آج بھی یورپ کے تمام میوزیموں اور گیلریوں میں دیکھا جاسکتا ہے یہاں تک کہ ہندوستان میں ایک برطانوی وائسرائے نے یہ منصوبہ بنایا تھا کہ تاج محل کو مسمار کرکے سنگ مرمر کو اور کسی کام میں لایا جائے۔

علم آثار قدیمہ' روشن خیالی اور ارتقاء

انیسویں صدی میں روشن خیالی کے نظریات اور ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے جہاں دوسرے علوم و فنون کو متاثر کیا۔ وہاں اس سے علم آثار قدیمہ بھی متاثر ہوا' بروس۔ جی۔ ٹرگر (Bruce G. Trigger) نے اپنی کتاب اے ہسٹری آف آریکالوجیکل تھاٹس (۱۹۹۳ء) میں ان دونوں نظریات کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے ان کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ مثلاً" روشن خیالی کے اہم پہلو یہ تھے۔

۱۔ تمام انسانی جماعتیں اور قومیں ایک ہی قسم کی ذہانت رکھتی ہیں اور ان کے ایک ہی قسم کے جذبات و احساسات ہوتے ہیں۔ اگرچہ ان جماعتوں میں افراد ذہنی اور جذباتی طور پر ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں۔ کوئی قوم اپنی جسمانی اور ذہنی ساخت کی وجہ سے علم حاصل کرنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہیں کرتی ہے اور اس کے لئے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے راستے کھلے ہوتے ہیں اس نقطہ نظر سے دنیا کی تمام قوموں کے لئے یہ ممکن ہے کہ وہ مغربی تہذیب سے سیکھیں اور اسے اختیار کریں اس سے یہ بھی نتیجہ اخذ کیا گیا کہ ٹیکنالوجی اور سائنس کی ترقی صرف یورپ میں ہی محدود نہیں

رہے گی۔ بلکہ دوسری قوموں میں بھی یہ صلاحیت ہے کہ وہ اسے اختیار کریں اور اس کی ترقی میں حصہ لیں۔ جہاں تک قوموں میں ثقافتی اختلافات کا تعلق ہے تو یہ اختلافات یا تو ماحول کی وجہ سے ہیں یا تاریخی عمل کے نتیجہ میں پیدا ہوئے ہیں۔

۲ ۔ انسانی تاریخ میں ترقی کا عنصر وہ واحد عنصر ہے کہ جو پوری تاریخ میں حاوی نظر آتا ہے۔ اور تاریخی عمل میں تبدیلی ایک مستقل جاری و ساری شے ہے یہ تبدیلی اچانک نہیں ہوتی ہے بلکہ مسلسل عمل کی شکل میں ہوتی ہے' اور یہ ایک فطری عمل ہے روحانی نہیں ہے۔ اس تبدیلی کے پس منظر میں انسان کی یہ شدید خواہش ہے کہ اس کی زندگی بہتر ہو اور وہ فطرت پر قابو پا کر اپنے ماحول کو سازگار بناسکے۔ بہت سے اسکالرز تبدیلی اور ترقی کو انسانی زندگی میں یقینی سمجھتے ہیں' جب کہ کچھ عالم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ لازمی چیز نہیں ہے۔

۳ ۔ ترقی کا مفہوم صرف ٹیکنالوجی میں ترقی نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب ہے کہ زندگی کے ہر شعبہ میں متوازی ترقی ہے جس میں سماجی ڈھانچہ ' سیاسی نظریات ' اخلاقیات اور مذہبی عقائد شامل ہیں۔ اس یکساں سوچ کے نتیجہ میں انسان ہر معاشرے میں ایک ہی طریقے سے مسائل کا حل ڈھونڈتا ہے۔ ترقی کے ان مراحل کو سمجھنے کے لئے انہیں مختلف ادوار میں تقسیم کردیا گیاہے۔ چنانچہ یورپ اس وقت دوسرے معاشروں کے مقابلہ میں زیادہ ترقی یافتہ ہے جبکہ دوسرے انسانی معاشرے ان مرحلوں میں ہیں کہ جن سے یورپ گذر چکا ہے۔ اور اس لئے ان معاشروں کو ترقی کے لئے ان مراحل سے گذرنا ہے۔

۴ ۔ ترقی انسانی ذہن کی تکمیل کرتی ہے لیکن یہ تکمیل انسانی ذہن یا انسانی فطرت کو تبدیل کرکے نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ ایک مستقل عمل کے ذریعہ سے ہوتی ہے کہ جس میں جہالت' توہمات اور جذبات کا خاتمہ کیا جاتا ہے۔ اس نظریہ نے انسان کو ان قوتوں سے آزاد کروایا۔ اب یہ اس کی ذمہ داری ہے، کہ وہ ترقی کرتے ہوئے راستہ میں جو رکاوٹیں آئیں انہیں خود دور کرے۔

۵۔ ترقی کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان عقل کا استعمال کرے' کیونکہ اسی کے ذریعہ سے اس کی حالت بہتر ہوگی۔ عقل کے استعمال کے نتیجہ میں انسان اس قابل ہوگا کہ وہ اپنے ماحول پر قابو پاسکے گا اور اس کے نتیجہ میں وہ فطری ذرائع کو اپنی خوش حالی کے لئے استعمال کرکے اپنے وقت کو معاشرہ کی تسخیر و تشکیل میں صرف کرسکے گا۔ عقل کا یہ استعمال ہی ہے جو انسان کو جانوروں سے ممتاز کرتا ہے۔

اس دوران ڈارون کے نظریہ ارتقاء نے ترقی یا پروگریس کے نظریہ کو مزید تقویت دی۔ کہ انسانی معاشرہ مرحلہ وار ترقی کی منزلیں طے کرتا ہے۔ جب یورپی اقوام امریکہ پہنچے اور وہاں انہوں نے ریڈ انڈین معاشروں کو تہذیب و تمدن کے ابتدائی مراحل میں دیکھا تو اس نظریہ کو اور سہارا ملا کہ معاشرے ترقی کی راہ میں ایک ساتھ نہیں ہیں۔ کچھ آگے بڑھ گئے ہیں اور کچھ ابھی راستہ میں ہیں اور کچھ ابھی رکے ہوئے ہیں اس لئے ان معاشروں کے مطالعہ سے ماہر علم بشریات نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کبھی یورپی معاشرے بھی اسی اسٹیج پر ہوں گے اس سے انہوں نے تاریخ میں پروگریس کے عمل کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اس مطالعہ میں علم آثار قدیمہ زبردست مددگار ثابت ہوا۔ کیونکہ ان آثار کی مدد سے ترقی کے مرحلوں کو متعین کیا جاسکتا ہے اور مختلف اقوام کی تہذیب کے معیار کو جانچا اور پرکھا جاسکتا تھا۔

روشن خیالی کے نظریات کو اس وقت سخت دھچکا لگا جب یورپ میں نپولین کی فتوحات کے نتیجہ میں قوم پرستی اور رومانویت اور نسل پرستی کے جذبات پیدا ہوئے۔ نو آبادیاتی نظام نے خصوصیت سے نسل پرستی کو خوب فروغ دیا اور اہل یورپ نے اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے اس نظریہ سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور مفتوحہ قوموں کو غیر مہذب اور وحشی ثابت کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ترقی کا عمل تمام قوموں میں ایک جیسا نہیں ہوتا ہے کچھ قومیں ترقی کرتی ہیں اور کچھ ایک ہی جگہ ٹھہر کر رہ جاتی ہیں جو قومیں ایک جگہ منجمد ہوجاتی ہیں ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں ماحول کی وجہ سے بھی ہوتی ہیں اور اس وجہ سے بھی کہ قوموں میں بیولوجیکل فرق ہوتا ہے ان

میں سے کچھ میں ترقی کرنے کی خواہش ہوتی ہے اور کچھ میں نہیں۔

نسل پرستی اور قوم پرستی کے نظریات اس قدر آگے گئے کہ انہوں نے مذہبی اعتبار سے بھی یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ تمام مخلوق آدم کی اولاد نہیں آدم صرف یہودیوں کے جد امجد تھے' باقی ہر قوم کے اپنے آدم جدا جدا ہیں اور یہ فرق پیدا کرنا اس لئے ضروری ہوا کہ اس مذہبی نقطہ نظر سے تمام قوموں کا سلسلہ حضرت آدم سے جاکر ملتا تھا اور اس صورت میں بیولوجیکل اور نسلی فرق کو برقرار رکھنے کی منطق پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔

اسی کے ساتھ ڈارون کے نظریہ ارتقاء اور یہ کہ اس ارتقائی عمل میں وہی باقی رہا کہ جو سب سے زیادہ طاقت ور تھا' جو کمزور تھے یا جن میں ماحول سے مطابقت کی صلاحیت نہیں تھی وہ اقوام ختم ہوگئیں اس نے یورپی اقوام کو یہ دلیل فراہم کی کہ اگر ایشیا و افریقہ اور امریکہ کی نسلیں ان کے استحصال سے ختم ہوتی ہیں تو یہ ایک فطری عمل ہے اور اس عمل کو پورا کرنے میں وہ کسی جرم کا ارتکاب نہیں کر رہی ہیں مقامی باشندے اس نیچرل سلیکشن کے عمل میں کمزور ہیں اس لئے تہذیب کے پھیلاؤ کے ساتھ ان کا ختم ہونا ضروری ہے۔

یہ وہ نظریات تھے اور یہ وہ پس پردہ منظر تھا کہ جس میں علم آثار قدیمہ کی ابتداء ہوئی۔

ابتداء

علم آثار قدیمہ کی ابتداء یورپ میں سب سے پہلے بحیثیت سائنسی علم کے ڈنمارک سے شروع ہوئی' اس کی وجہ یہ تھی کہ انیسویں صدی میں نپولین کے اقتدار اور جنگوں کے نتیجہ میں ڈنمارک بری طرح سے متاثر ہوا اس کا بحری بیڑہ انگلستان نے تباہ کردیا۔ اور ۱۸۰۷ء میں کوپن ہیگن پر انگریزی بحری بیڑے نے بمباری کی اس فوجی شکست نے اہل ڈنمارک کو بری طرح سے احساس کمتری میں مبتلا کردیا لہٰذا قوم کے اس

احساس کو دور کرنے اور ان میں قومی فخر پیدا کرنے کی غرض سے ماہر آثار قدیمہ نے اس بات کی کوشش کی کہ اس کے سہارے اس کا قدیم ماضی تشکیل دیا جائے اور یہ ثابت کیا جائے کہ ڈنمارک تاریخ میں ہمیشہ سے ممتاز رہا ہے۔

ڈنمارک میں ماہرین نے قبل از تاریخ کے زمانے کو ۵ ادوار میں تقسیم کیا پہلا ابتدائی پتھر کا زمانہ تھا جس میں کہ پتھروں سے اوزار و ہتھیار بنائے جاتے تھے' اس کے بعد دوسرا پتھر کا زمانہ آیا جس میں پہلی مرتبہ دھات کا استعمال ہوا' اس زمانہ میں مردوں کو دفن کرنے کا رواج ہوا اس کے بعد برونز دھات کا زمانہ آیا اور پھر لوہے کا زمانہ اس زمانہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا' یہاں تک کہ تاریخی عمل تاریخی عہد میں داخل ہو گیا۔

۱۸۶۵ء میں انگلستان میں جان لوبوک (John Lubbock) نے پیلیوپیتھک اور نیولیتھک یعنی قدیم پتھر کا زمانہ اور جدید پتھر کا زمانہ میں علم آثار قدیمہ کو تقسیم کیا۔ اس کے بعد فرانس کے ماہرین نے اسی کو اختیار کرتے ہوئے فرانس میں جو آثار ملے' انہیں ان ادوار میں تقسیم کرنے کا تجربہ کیا۔

ادوار کی اس تقسیم کے نتیجہ میں ماہرین نے انسانی کلچر' اور تہذیب و تمدن کے ارتقاء کا جائزہ لیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ انسان نے سادگی سے پیچیدگی کی طرف ارتقائی مراحل طے کئے ہیں۔

آثار قدیمہ کا سیاسی استعمال

بروس ۔ جی ۔ ٹرگر نے اپنی کتاب "آثار قدیمہ کی تاریخ" میں خصوصیت سے علم آثار قدیمہ کے سیاسی استعمال پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ کیونکہ جن حالات میں اس علم کا ارتقاء ہوا اس کا اثر سیاست پر گہرا پڑا۔ یہ حالات تھے سفید فام اقوام کے سیاسی و ثقافتی پھیلاؤ کے۔ ایک طرف امریکہ ' آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں سفید فام اقوام نے اپنا اقتدار قائم کرکے وہاں کے مقامی باشندوں کو قتل کرکے صفحہ ہستی سے مٹا دیا یا

انہیں پسماندہ رکھ کر ان کے کلچر کو تباہ و برباد کردیا دوسری طرف انہوں نے ایشیا و افریقہ میں اپنی نو آبادیات قائم کرنا شروع کیں تو وہاں کے مقامی باشندوں پر حکومت کرنے اور ان کے ذرائع کو استعمال کرنے کے لئے انہوں نے جن نظریات کی تشکیل دی اس میں سفید فام اقوام کی نسلی برتری اور مقامی باشندوں کی پسماندگی کو ثابت کیا گیا ہے۔ ان سیاسی مقاصد کو پورا کرنے میں علم آثار قدیمہ کی مدد لی گئی۔

امپیریل ازم کے اس پھیلاؤ میں ڈارون کا نظریہ ارتقاء اور اس کا نیچرل سلیکشن کا عمل بھی ان کے عزائم کو پورا کرنے میں مددگار ثابت ہوا' کیونکہ اس کے تحت جو قومیں کمزور ہوتی ہیں وہ برتر تہذیب کے پھیلاؤ کے ساتھ ختم ہوجاتی ہیں لہٰذا یورپیوں کے مقابلے میں قدیم امریکی' آسٹریلوی یا نیوزی لینڈ کے باشندوں کا ختم ہونا اخلاقی مسئلہ نہیں تھا بلکہ یہ ایک بائیولوجیکل عمل تھا' لہٰذا اس نظریہ کے تحت ان لوگوں کا قتل عام یا انہیں ان کی زمینوں سے بے دخل کرنا اور بے عمل بنانا صحیح ہوجاتا تھا۔ اس کے علاوہ اٹھارویں صدی میں یہ نظریہ مقبول تھا کہ تاریخی عمل ایک سیدھی لائن میں ترقی کی طرف گامزن ہے اور معاشروں کی ترقی سادگی سے پیچیدگی کی طرف ہوتی ہے۔ اس نقطہ نظر سے قدیم معاشروں کے کلچر سے دلچسپی نہیں ہوئی کیونکہ وہ ابتدائی مراحل میں تھے اور ان سے کچھ سیکھا نہیں جاسکتا تھا' یہی وجہ تھی کہ امریکہ' آسٹریلیا' نیوزی لینڈ اور افریقہ میں آثار دریافت کرنے کی کوششیں نہیں ہوئیں ان کی تہذیبوں کو ٹھہرا ہوا کہا گیا اور اگر کوئی تبدیلی دیکھی تو اسے باہر والوں سے منسوب کرکے داخلی تبدیلی سے انکار کیا۔

چنانچہ مقامی باشندوں کو کمزور' بے عمل ' غیر مہذب اور کلچر سے عاری ثابت کرنے کی غرض سے علم آثار قدیمہ نے سفید اقوام کی مدد کی' مثلاً" امریکہ میں جب کچھ ٹیلے دریافت ہوئے تو ان کی اول تو کھدائی نہیں کی گئی کیونکہ سفید فام اقوام کو اس بات کا ڈر تھا کہ کہیں اس کھدائی کے نتیجہ میں ان کا ترقی یافتہ کلچر اور اس کے آثار برآمد نہ ہوجائیں۔ اس لئے ابتداء میں تو یہ خیال پیش کیا گیا کہ ان ٹیلوں کے

معمار ریڈ انڈین نہیں تھے بلکہ باہر سے کچھ گروہ آئے تھے جنہوں نے یہ تعمیر کئے تھے لیکن جب بعد میں ان ٹیلوں کی کھدائی اور ان سے جو آثار دریافت ہوئے وہ یورپی کلچر کے مقابلے میں کوئی زیادہ ترقی یافتہ نہیں تھے اس لئے اس دریافت سے اہل یورپ کو اطمینان ہوا کہ ریڈ انڈین کا کلچر قدیمی اور ٹھہرا ہوا تھا اور اس لئے وہ ان کے مقابلے کے قابل نہیں تھا۔

اس قسم کی ذہنیت کا مظاہرہ افریقہ میں بھی کیا گیا اور ان کے کلچر کو انسانی تہذیب کے ابتدائی دور میں رکھا گیا' اگرچہ افریقی کلچر بڑا متنوع تھا' اس میں پتھر کے زمانے سے لے کر بڑی اور اعلیٰ سلطنتوں کے آثار بھی تھے مگر انہیں نظر انداز کر کے یہ دلیل دی گئی کہ اگر افریقہ میں اعلیٰ تمدن پیدا ہوا تو اس کو پیدا کرنے والے افریقی نہیں تھے بلکہ یہ لوگ مصر اور عراق سے آئے تھے اور ان تہذیبوں کا اس لئے زوال ہوا کہ ان میں نیگرو خون شامل ہوگیا تھا۔

زمباوے میں جو قدیم آثار ملے اس سے ایک ترقی یافتہ کلچر کی شہادت ملتی تھی' مگر انہیں افریقی تسلیم نہیں کیا گیا بلکہ یہ نظریہ دیا گیا کہ دراصل زمانہ قدیم میں افریقہ میں سفید فام اقوام آئیں تھیں۔ اور یہ آثار ان کے عہد کے ہیں لہٰذا جب زمباوے اور موزمبیق میں پتھر کی عمارتیں ملیں' جنہیں حضرت سلیمان اور ملکہ شیبا کے محلات قرار دیا گیا تو اس سے یورپی عیسائیوں کے عقیدے کو تقویت ملی اور انہوں نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سفید فام اقوام کی افریقہ میں فتوحات ان کی دوبارہ سے اپنے وطن کو واپسی ہے۔

روڈیشیا (زمباوے) میں جب سفید فام لوگوں نے اپنی حکومت قائم کرلی تو انہوں نے یہ سرکاری پالیسی بنائی کہ کسی ایسی دریافت کی تشہیر نہیں کی جائے کہ جس سے افریقیوں کی برتری ثابت ہو' خصوصیت سے آئن اسمتھ کے زمانے میں اس پر سختی سے عمل کیا گیا۔

روڈیشیا کے خاتمے اور زمباوے کی آزادی کے بعد اب ان قدیم آثاروں کو افریقی

اب قوم پرستی کے فروغ کے لئے استعمال کر رہے ہیں۔

جب سفید فام آسٹریلیا گئے تو وہاں بھی ان کا رد عمل اس قسم کا تھا' ابتداء میں ان کا خیال تھا کہ آسٹریلیا کے باشندے باہر سے آئے ہیں اور تہذیبی لحاظ سے پس ماندہ ہیں۔ لیکن جب آہستہ آہستہ ان کے آثار دریافت ہونے شروع ہوئے تو ان سے یہ ثابت ہوا کہ ان کا کلچر نیا نہیں بلکہ پرانا ہے اور دوسرے یہ کہ ان کا کلچر ٹھہراؤ ہوا نہیں ہے بلکہ اس میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ خصوصیت سے آرٹ کے جو نمونے ان آثار سے ملے' انہوں نے آسٹریلوی باشندوں کی مہارت کو ثابت کردیا' اس لئے بعد میں اس قدیم کلچر کو قومی ورثہ کے طور پر آسٹریلیا میں اپنا لیا گیا' یہ وہ عمل تھا کہ جو امریکہ میں نہیں ہوا۔

بعد میں ان آثار قدیمہ کی بنیاد پر آسٹریلیا کی سیاست میں جھگڑے بھی ہوئے' کیونکہ قدیم باشندوں نے ان شہادتوں کی بنیاد پر سفید فام لوگوں سے اپنی زمینیں واپس لینے کے لئے مقدمے کئے اور ان کے نتائج کو استعمال کرتے ہوئے انہوں نے اپنے احساس کمتری کو دور کیا اور سفید فام لوگوں سے مقابلہ کیا۔

آسٹریلیا کے قدیمی باشندے اس سے خوش نہیں ہیں کہ ان آثاروں کو سفید فام ماہرین علوم اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں اور ان کے ذریعہ وہ اپنی تحقیقات کو صحیح ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس طرح سے وہ ان کے تاریخی ورثے سے بھی انہیں محروم کرنا چاہتے ہیں۔

میکسیکو میں ہسپانوی فاتحین اور حکمرانوں نے قدیم اور قبل از تاریخ عہد کے مطالعہ اور اس کے آثاروں کو دریافت کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ کیونکہ ان کے خیال میں اس سے عیسائی عقائد کو نقصان پہنچتا۔ لیکن انیسویں صدی میں میکسیکو میں دو گروہ ہوگئے ان میں ایک لبرل گروہ تھا جو اس بات کا حامی تھا کہ میکسکو کی قدیم تاریخ کو قومی تاریخ کا حصہ بنایا جائے جب کہ اس کے مقابلہ میں رجعت پرست قبل از تاریخ زمانے کے مخالف تھے۔ لیکن جب ۱۹۱۰ء میں کسانوں کا انقلاب کامیاب ہوا اور چونکہ

اس انقلاب کے حامیوں میں اکثریت مقامی باشندوں کی تھی۔ اس لئے حکومت کا نقطہ نظر بدلا اور قدیم و قبل از تاریخ کے آثاروں کی دریافت کی ہمت افزائی کی گئی۔ ان سرگرمیوں کو قوم پرستی کے جذبات کی وجہ سے بھی ایک نئی زندگی ملی۔ کیونکہ جب میکسیکو کو اسپین سے آزاد کرانے کی تحریک چلی تو یہ کوششیں ہوئیں کہ قدیم ہسپانوی باشندوں کو ملا کر ایک قوم کی تشکیل کی جائے تاکہ مختلف نسلی و ثقافتی گروہ متحد ہوسکیں اس سلسلہ میں جہاں تاریخ سے مدد لی گئی وہاں علم آثار قدیمہ کو بھی استعمال کیا گیا اور جب قدیم و بعد از تاریخ کے ادوار کو دریافت کیا گیا تو ان کے نتائج کے زیر اثر نسلی تعصبات کو دور کرکے انسانی و قومی جذبات کو ابھارا گیا۔

نو آبادیات کے خاتمہ کے بعد نئے آزاد ممالک آثار قدیمہ کو اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کررہے ہیں۔ مثلاً" مصر اور عراق میں ان آثار کی دریافت اور ان کے نتائج کو نئے ابھرتے ہوئے قوم پرستی کے جذبات کے لئے استعمال کیا گیا۔ ایران میں شاہ کے زمانہ میں ان کو بادشاہت کے استحکام کے لئے مقبول عام بنایا گیا۔ اسرائیل میں اس کو یہودی اپنے مقاصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں اور ان آثار کی دریافت کر رہے ہیں کہ جس سے یہودوں کا اسرائیل یا فلسطین پر حق ثابت ہو اور ساتھ ہی ان کی مذہبی شناخت ابھرے۔ انہیں اس لئے نہ تو قبل از تاریخ سے دلچسپی ہے اور نہ ہی اسلامی عہد کے آثار سے۔

جاپان نے دوسری جنگ عظیم میں شکست کے بعد قوم سے مایوسی اور شکست کے احساس کو دور کرنے کے لئے علم آثار قدیمہ کو استعمال کیا اور جاپان کی قدیم تاریخ کی ان آثار کی مدد سے تشکیل کرکے انہیں عوام میں مقبول بنایا تاکہ لوگوں میں قوم پرستی کے جذبات پیدا ہوں اور جو غیر یقینی کیفیت پیدا ہوگی تھی اسے دور کیا جاسکے اس لئے انہوں نے اس نظریہ کو فروغ دیا کہ جاپان کے لوگوں کا ایک نسلی گروہ سے تعلق ہے اور یہ کہ جاپان کے حکمران طبقے باہر سے آئے تھے صحیح نہیں۔

روسی نقطہ نظر

بروس۔ جی۔ ٹرگر نے روسیوں کے اس نقطہ نظر کی بھی وضاحت کی ہے کہ جو انہوں نے علم آثار قدیمہ کی تحقیق میں استعمال کیا اور جس کے غلبہ سے اس علم کو ایک نئی جہت ملی اور سوچ کے بہت سے دروازے کھلے۔

لینن کے زمانے تک ماہر آثار قدیمہ کو اپنی تحقیق میں پوری پوری آزادی تھی اور وہ اس علم میں سائنسی اور لبرل نظریات کو استعمال کر رہے تھے۔ مگر اسٹالن کے زمانے میں انہیں اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ مارکس ازم اور ریاست کے قوانین کے تحت کام کریں، جن ماہرین نے اس سے انحراف کیا انہیں یا تو کام کرنے سے روک دیا گیا یا انہیں جلاوطن کردیا گیا۔ مارکس نے اگرچہ آثار قدیمہ کے علم کے بارے میں تو کچھ نہیں لکھا، مگر اس نے قدیم اوزاروں اور ہتھیاروں کے بارے میں یہ ضرور لکھا ہے کہ اوزار محنت کے عمل کی نشاندہی کرتے ہیں اس لئے ان کا مطالعہ کرتے ہوئے یہ چیز دیکھنی چاہئے کہ انہیں کیسے اور کیوں بنایا گیا؟ اس سے انسانی تاریخ کے مختلف معاشی ادوار کو سمجھنے میں مدد ملے گی کیوں کہ ان اوزاروں سے نہ صرف انسانی کلچر کی ترقی کا پتہ چلتا ہے بلکہ یہ بھی کہ اس وقت کی سماجی زندگی کیسی تھی اور معاشرے میں محنت کا درجہ کیا تھا؟

مارکسی ماہرین آثار قدیمہ نے جس نقطہ نظر سے آثار کی تحقیق کی اس میں انہوں نے اس پر زور دیا کہ کلچر میں تبدیلی ٹیکنالوجی کی وجہ سے نہیں آتی بلکہ سماجی تنظیم نے اس عمل کو پیدا کیا اس لئے ان کی دلیل یہ تھی کہ آثار قدیمہ سے جو ملتا ہے س پر رائے قائم نہیں کرنی چاہئے بلکہ اس عمل کا مطالعہ کرنا چاہئے کہ جس نے آثار کو پیدا کیا ہے۔ اس لئے اس مطالعہ میں ذرائع پیدوار کی زیادہ اہمیت ہے۔

انہوں نے پہلی مرتبہ آثار قدیمہ کی دریافت اور ان کے نتائج میں عام لوگوں کی سرگرمیوں اور کلچر کی ترقی میں ان کے حصہ کو اجاگر کیا اور آثار کی کھدائی کے وقت عام لوگوں کی بستیوں ان کے استعمال کے سامان اور اوزاروں پر خصوصیت سے روشنی

ڈالی اور یہ ثابت کیا کہ تبدیلی اس وقت آتی ہے کہ جب لوگوں کی مجموعی طاقت متحرک ہو' انہوں نے قبرستانوں کی کھدائی کرکے اس وقت کے لوگوں کے مذہبی عقائد کا مطالعہ کیا اور ساتھ میں معاشرے میں سماجی اونچ نیچ کا تجزیہ کیا اور اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ دفن کرنے میں مرنے والے کی سماجی مرتبہ کا بھی دخل ہوتا تھا اور اس کے ساتھ جو سامان رکھا جاتا تھا وہ اس کو ظاہر کرتا ہے۔ مگر جب نجی جائیداد کا ادارہ مضبوط ہوتا گیا تو اس کے ساتھ ہی وارث قیمتی اشیاء کو دفن کرنے سے گریز کرنے لگے۔

روسی ماہرین نے یہ بھی ثابت کیا کہ سلاؤ نسل پس ماندہ نہیں تھی اور اب تک جو یہ خیال عام تھا کہ روسی شہر اسکینڈی نیویا کی قائم کردہ نو آبادیات ہیں یہ غلط ہے بلکہ یہ شہر تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ قائم ہوئے۔

بائبل اور آثار قدیمہ

اہل یورپ نے مشرق وسطی میں عیسائی دور کے آثار کو تلاش کرنے میں اس لئے بھی دلچسپی لی کہ ان کی بنیاد پر وہ بائبل اور عیسائی عقائد کو درست ثابت کرنا چاہتے تھے' بلکہ بائبل میں دیئے ہوئے مواد کی روشنی میں انہوں نے مصر' عراق' شام اور فلسطین میں کھدائیاں کرکے اس عہد کے آثار دریافت کئے' اب فلسطین کے علاقے میں اسرائیل بھی ان آثاروں کو دریافت کرنے میں مصروف ہے۔

علم آثار قدیمہ کیا ہے؟

ابتداء میں علم آثار قدیمہ کو تاریخ' انتھراپولوجی (علم بشریات) اور اتھنولوجی (علم لسانیات) کا ایک حصہ سمجھا جاتا تھا اور یہ تاریخ کے ماخذوں میں سے ایک تھا کہ جس کی دریافتوں اور نتائج کی بنیاد پر قدیم اور قبل از تاریخ کا ماضی تشکیل دیا گیا لیکن بعد میں اس علم کے ماہرین نے اس بات کی کوشش کی کہ اسے دوسرے علوم کے اثر سے نکال کر آزاد و خودمختار علم کا درجہ دیا جائے۔ کیونکہ اس علم کا دائرہ دوسرے علوم سے مختلف ہوجاتا ہے اور یہ سیاسیات' معاشیات اور نسلیات کے برعکس لوگوں کا براہ

راست مطالعہ نہیں کرتا ہے اور نہ اس کی بنیاد تحریری مواد پر ہوتی ہے اس کا انحصار آثاروں پر ہے اور ان کے ذریعے یہ لوگوں اور معاشروں کا مطالعہ کرتا ہے اور ان کی عادات' رسم و رواج اور رہن سہن کے طریقوں کے بارے میں ڈھانچہ تشکیل کرتا ہے۔

آئن ہوڈر نے اپنی کتاب "ریڈنگ دی پاسٹ" (۱۹۸۸ء) میں لکھا ہے کہ علم آثار قدیمہ مادی اشیاء کی مدد سے ماضی بناتا ہے یہ اشیاء خاموش ہوتی ہیں مگر وہ ان کی خاموشی سے معنی نکالتا ہے اس کا کام ہوتا ہے کہ پہلے وہ جگہ کے بارے میں معلومات حاصل کرے پھر اس کی تاریخ و عہد کو متعین کرے' اور اس کے بعد ان چیزوں کا لوگوں سے رابطہ تلاش کرے' اس کے بعد وہ اس قابل ہوتا ہے کہ اشیاء کے کردار سے لوگوں کے بارے میں بتا سکے۔ کیونکہ یہ اشیاء مل کر ایک مادی کلچر کی نشاندہی کرتی ہیں' یہ مادی کلچر صرف موجود ہی نہیں ہوتا بلکہ اسے کوئی پیدا کرتا ہے اور اس کا کوئی کام بھی ہوتا ہے اس طرح سے مادی کلچر لوگوں کا نمائندہ بن جاتا ہے۔

علم آثار قدیمہ کا کئی نظریات سے مطالعہ کیا جاتا ہے اس میں ایک وہ نظریہ ہے کہ جو فنکشل کہلاتا ہے جس میں بائیولوجی اور جیولوجی کی مدد سے آثار قدیمہ کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور درخت' جانور' سمندر اور دریا میں جو تبدیلیاں آئی ہیں ان سے ماحول پر کیا اثرات ہوئے اور اس سے انسانی معاشرے اور ان کا کلچر کس طرح سے ارتقاء پذیر ہوا۔ مثلاً" نیولیتھک دور میں انسان کے پاس وہ موثر اوزار نہیں تھے کہ جن کی مدد سے وہ جنگل صاف کر سکتا' اس لئے اس نے ان علاقوں میں کاشت شروع کی کہ جو میدان تھے یا جہاں جنگل کم تھے۔

اس سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مشرق وسطی میں پہلے برفانی دور کے بعد جب خشکی ہوئی تو شکاری اور پھل جمع کرنے والوں نے دریاؤں کے کنارے جانور پالنا اور پودوں و گھاس کو غذا کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا ان کی تحقیق کے نتائج میں سے ایک یہ تھا کہ زراعت کی ابتداء ان علاقوں میں ہوئی کہ جہاں باجرہ خود رو تھا' اس

لئے سیلابی مٹی میں جب اس کی کاشت کی گئی تو یہ خوب پیدا ہوا۔

قبل از تاریخ کا کلچر برف والے علاقوں یاصحراؤں میں محفوظ رہا اور معتدل آب و ہوا والے علاقوں میں یہ ختم ہوگیا ان آثار سے معاشی حالات تو معلوم ہوجاتے ہیں مگر سماجی حالات بہت کم معلوم ہوتے ہیں۔

آثار قدیمہ کے ماہرین نے نیو آرکیالوجی کے تحت اسے ایک اور نقطہ نظر سے دیکھا۔ اس میں اشیاء کو بے جان سمجھ کر دیکھا جاتا ہے کہ جو معاشرے کے کلچر کی عکاسی کرتی ہیں' اس طرح اشیاء کے کام کو دیکھا جاتا ہے اور فرد کے احساسات و جذبات کو نظر انداز کردیا جاتا ہے۔

مار کسسٹ نقطہ نظر سے جو تبدیلیاں انفرادی اور مجموعی مفادات کے تحت عمل میں آتی ہیں ان کو آثار میں تلاش کیا جاتا ہے یہ معاشرے کی تبدیلی و ٹیکنالوجی کی وجہ سے نہیں بلکہ سماجی تنظیم کی وجہ سے مانتے ہیں۔

ایک اور نقطہ نظر یہ ہے کہ تبدیلی کے اس عمل کو دیکھا جائے کہ وہ ایک مرحلہ سے دوسرے مرحلہ میں کس طرح سے وقوع پذیر ہوتی ہے۔ مثلاً" شکاری معاشرہ کس طرح اور کیوں کر کاشتکاری میں تبدیل ہوا۔ اس نقطہ نظر میں عمل کے تسلسل کا مطالعہ ہوتا ہے۔

انسانی معاشروں میں کلچر ایک تو ایک دوسرے کے اثر اور تعلق سے پھیلتا ہے اور اس کے بعد اس کے پھیلاؤ میں لوگوں کا ہجرت کرنا اہم کردار ادا کرتا ہے' لوگوں کی ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت میں اہم وجہ آبادی کا بڑھنا ہوتا ہے' اس لئے مختلف کلچر ایک دوسرے سے متصادم بھی ہوتے ہیں اور سیکھتے بھی ہیں۔

چونکہ دوسرے علوم کی طرح آثار قدیمہ کا علم بھی مردوں کے نقطہ نظر سے منظم کیا گیا اور چونکہ اس کے نظریات تشکیل دینے میں مرد' اور وہ بھی طبقہ اعلیٰ یا مڈل کلاس کے تھے' اس لئے ان دونوں کی چھاپ اس پر نظر آتی ہے۔ لہٰذا عورتوں نے اس پر سخت تنقید کی کہ انہیں آثاروں کی دریافت میں اس طرح سے نظر انداز کردیا کہ

جس طرح تاریخ سے۔

انہوں نے اعتراض کیا کہ علم آثار قدیمہ کو ماہرین زمانہ حال کی نظر سے دیکھتے ہیں اور محنت کی تقسیم میں عورتوں کو زیادہ حصہ نہیں دیتے ہیں یا ان کی محنت کو چھپا دیتے ہیں' شکار اور تجارت کو مردوں کے پیشے بنایا جاتا ہے اور عورت سے کھانا پکانا' کپڑے بننا اور پھل جمع کرنا ثابت کیا جاتا ہے۔ جہاں تک اوزار بنانا ہے اسے مرد سے منسوب کیا جاتا ہے اور عورت سے برتن بنوائے جاتے ہیں اس طرح عورت و مرد میں محنت کی یہ تقسیم اور پیشے حال کے پیدا کئے ہوئے ہیں زمانہ قدیم اور قبل از تاریخ عہد میں اس قسم کی کوئی تقسیم نہیں تھی۔ لہٰذا آثار قدیم کی دریافتوں سے جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں ان میں مرد طاقت ور' جارح' چست اور حکمران ہے۔ جب کہ عورت کمزور' خاموش' صابر اور مرد پر انحصار کرنے والی ہے۔ لہٰذا معاشرے کے اہم مسائل جن میں جنگ' راہنمائی' وراثت' ذرائع پر کنٹرول شامل ہیں ان سب میں مردوں کی برتری دکھائی گئی ہے۔

اس لئے عورتوں نے اس کو رد کیا ہے اور دلیل دی ہے کہ جنس کے ساتھ پیشوں کو منسوب کرنا غیر منطقی ہے اور یہ ثابت کرنا کہ روایتی معاشرے میں عورتوں نے ایک متوازی دنیا بنالی تھی۔ یہ بھی صحیح نہیں ہے۔ قدیم اور قبل از تاریخ کے عہد میں عورتیں ہر قسم کے پیشوں اور کاموں میں مصروف تھیں اور اس وقت تک جنس کی بنیاد پر محنت کی تقسیم بھی عمل میں نہیں آئی تھی۔

گورڈن چائلڈ

علم آثار قدیمہ میں گورڈن چائلڈ کے نظریات نے انقلابی تبدیلیاں کیں' اس نے مختلف موضوعات پر کئی کتابیں لکھیں' جن میں مشہور یہ ہیں:

۱۔ یورپی تہذیب کی ابتداء۔

۲۔ انسان خود کو بناتا ہے۔

۳۔ تاریخ میں کیا ہوا؟۔

گورڈن چائلڈ کا کہنا تھا کہ برتن' زیورات اور دفن کی رسومات ہر معاشرے میں مقامی رہیں اور ان سے مقامی شناخت قائم رہی اس کے مقابلے میں آلات' اوزار اور ہتھیار پر باہر کے اثرات ہوتے رہے ان میں مقامی طور پر بھی تبدیلی ہوئی اور ان کی نقل بھی کی گئی۔ لہٰذا ان سے ہمسایہ ملکوں کے کلچراور ان کے اثرات کا پتہ چلتا ہے۔

چائلڈ کی تحقیق کے نتائج یہ تھے کہ پہلی بر نباری دور کے بعد تین علاقے تھے کہ جہاں انسان جمع ہوئے' نیل' دجلہ و فرات اور وادی سندھ ان علاقوں کے وسائل آبادی سے زیادہ تھے اس لئے یہاں منظم معاشرے تشکیل ہوئے' ریاست کا ڈھانچہ بنا' شہر آباد ہوئے اور صنعت و آرٹ میں ترقی ہوئی۔

چائلڈ کا کہنا ہے کہ کانسی پہلے صرف ایک معاشرے میں نہیں ہوگی کیونکہ یہ ایک پیچیدہ عمل تھا اور اس کے بعد یہ دوسرے معاشروں میں پھیلی ہوگی اور اس کا استعمال ہتھیاروں کے لئے ہوا ہوگا۔

وہ تاریخ میں دو بڑے انقلابوں کا تذکرہ کرتا ہے' ایک وہ کہ جب انسانی معاشرے پھل اور کھانے کی اشیاء جمع کرنے دور سے گذر کر کھانے کی اشیاء پیدا کرنے کے دور میں داخل ہوئے۔ اور دوسرا انقلاب جب گاؤں شہروں میں تبدیل ہوئے۔ یہ دونوں انقلابات ٹیکنالوجی اور آبادی کے بڑھنے کی وجہ سے پیدا ہوئے۔

یورپ میں کس طرح سے تبدیلی آئی اور کیوں کر وہ مشرق سے مختلف ہوا اس کے بارے میں چائلڈ کہتا ہے کہ مشرق وسطیٰ کے حکمران طبقوں نے بے تحاشہ مادی اشیاء کو استعمال کرکے انہیں ضائع کرنا شروع کردیا اس کے بعد جنگوں نے ان کے وسائل کو ختم کرنے میں مدد دی' دوسری طرف ان کی ہمسایہ چھوٹی چھوٹی تہذیبیں ابھرنے لگی اور اپنے وسائل کو خود استعمال کرنے لگیں۔ جس کی وجہ سے مشرق وسطیٰ کی ترقی رک گئی اس عمل کے دوران یورپ میں ترقی ہوئی' زائد آبادی ہجرت کرکے یورپ گئی جس سے ٹیکنالوجی کی منتقلی ہوئی' چائلڈ کا خیال ہے کہ کانسی کے عہد میں

یورپ کی اپنی تہذیب کی ابتداء ہوئی۔ اور مشرق سے اس اثر کے باوجود یورپ نے اس ٹیکنالوجی کو بہتر پایا اور اس میں اضافے کئے جس کی وجہ سے اس کی تہذیب مشرق کی روایتی تہذیب سے مختلف ہوگئی' اس کا اظہار کانسی دور کے کریٹ سے ہوتا ہے جو اپنے وقت میں بڑا جدید تھا اور اس کے سوچنے کا انداز بھی جدید تھا' مثلاً" کریٹ میں مصر اور میسوپوٹامیہ کی طرح نہ تو عالیشان محلات تھے' نہ مندر' مقبرے اور نہ ہی اہرام اس کا مطلب ہے کہ اس تہذیب میں جبر و تشدد اور مطلق العنانیت نہیں تھی۔ اس لئے عام لوگوں نے جو آرٹ پیدا کیا اس میں ان کی آزادی جھلکتی ہے۔

موجودہ دور میں سائنس کی ترقی نے بھی علمِ آثار قدیمہ کی ترقی میں حصہ لیا ہے اور اس کی مدد سے اب آثار کی کھدائی بہتر طریقوں سے ہونے لگی ہے اشیاء کی تاریخ کا تعین یقین کے ساتھ کیا جانے لگا ہے اور ان آثار کو محفوظ رکھنے کے لئے سائنسی طریقوں کو زیادہ استعمال کیا جانے لگا ہے۔

آثار قدیمہ اور پاکستان

۱۸۶۱ء میں برطانوی حکومت نے ہندوستان میں محکمہ آثار قدیمہ کو قائم کردیا تھا' اس کے ابتدائی ماہرین میں جان مارشل' الکزینڈر کننگھم اور مور تمر وھیلر تھے کہ جنہوں نے برصغیر میں شروع شروع میں قدیم آثاروں کی کھدائی کی برصغیر کے لوگوں میں تاریخی شعور بڑھا بلکہ اس کا اثر علم آثار قدیمہ کی ترویج و ترقی میں صورت میں بھی نکلا' کیونکہ کوئی بھی نئی دریافت ماہرین میں ایک نیا جذبہ اور ولولہ پیدا کرتی ہے اور ان کے سامنے ایک نئی دنیا ہوتی ہے' جو دنیا کی نظر سے اب دور پوشیدہ تھی اور اب اس کے رازوں سے پردہ اٹھانے کا کام ماہرین کا ہوتا ہے۔

یہ ایک پورے معاشرے کی دریافت ہوتی ہے ان کی زبان جاننے سے لے کر ان کے سیاسی' سماجی اور معاشی زندگی تک کو دوبارہ سے تشکیل دینا ہوتا ہے اس لئے موہنجو داڑو کی دریافت نے برصغیر کو تاریخی گمنامی سے نکالا اور انہیں تاریخی دور میں داخل کیا۔

برصغیر کی تقسیم کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے علم آثار قدیمہ کے ماہرین اپنے اپنے نقطہ نظر اور حالات کے تحت تحقیق شروع کی۔ چونکہ ہندوستان میں قدیم تاریخ کا کوئی تحریری مواد نہیں ہے اس لئے ماہرین آثار قدیمہ قدیم دور کی دریافتوں کے ذریعہ اس مواد کو فراہم کر رہے ہیں کہ جن کی بنیاد پر قدیم ہندوستان کی تاریخ تشکیل ہو سکے اور جہاں جہاں ان کی تاریخ میں خلا ہیں وہ ان آثار کی مدد سے بھرے جا رہے ہیں جیسے جیسے نئے آثار دریافت ہو رہے ہیں اسی طرح سے تاریخی معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے

اور اس بات کا بھی اندازہ ہورہا ہے کہ قدیم دور میں برصغیر کا ذہن کس قدر پختہ اور ترقی یافتہ تھا۔

پاکستان میں محکمہ آثار قدیمہ خصوصیت کے ساتھ ان آثاروں کی دریافت میں دلچسپی رکھتا ہے کہ جن کا تعلق مسلمانوں کے دور حکومت سے ہو' اس کے برعکس زمانہ قبل از تاریخ یا قدیم عہد کے آثاروں سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے اگر موہنجو دوڑو ' ٹیکسلا یا ہڑپہ کے آثار محفوظ ہیں تو اس کی وجہ بین الاقوامی اداروں کی دلچسپی ہے' ورنہ ہمارے ہاں ان کے بارے میں یہ تاثر ہے کہ اگر انہیں ختم کردیا جائے تو اچھا ہے کیونکہ یہ ہماری شناخت میں کسی بھی طرح کام نہیں آئیں گے۔ کیونکہ ہماری اسلامی شناخت ہے اور ان آثاروں کا تعلق اسلام سے قبل کے عہد کا ہے۔

جب محکمہ آثار قدیمہ نے منصورہ کے کھنڈرات دریافت کئے تو یہ نہیں بتایا کہ اس کے آثار قدیم شہر برہمن آباد پر ہیں جو کہ راجہ دملا کا دارالحکومت تھا' تھوڑی کھدائی کے بعد کام روک دیا تھا اور صرف اس جامع مسجد کا چرچا ہوا کہ جو عرب دور کی تھی۔

اس پاکستان میں علم آثار قدیمہ نظریات میں جکڑا ہوا ہے اور ان نظریات کے ساتھ ہی اس میں تعصبات بھی آگئے ہیں ان کے منصوبوں میں سے ایسا کوئی منصوبہ نہیں ہے کہ وہ غیر اسلامی زمانہ کے آثار قدیمہ دریافت کرکے ان کی اہمیت کو اجاگر کریں۔ اس تنگ نظری کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارا ماضی صرف اسلامی تاریخ تک محدود ہے اور اس سے پہلے کے عہد کی ہر چیز کو ہم نے اپنی ماننے سے انکار کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ پاکستان کے ماہرین آثار قدیمہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ عالموں کے کردار کی بجائے افسر بننا زیادہ پسند کرتے ہیں اس لئے یہ غیر ملکی ماہرین کو پاکستان آنے کی دعوت دیتے ہیں اور اپنا کام ان کے ذمہ کرکے خود دفتری کاموں میں مشغول رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تقسیم کے بعد پاکستان میں اگر آثاروں کی دریافت کا کام ہوا ہے تو وہ غیر ملکی ماہرین نے کیا ہے جن میں فرانسیسی ' جرمن ' اطالوی اور جاپان

شامل ہیں۔

میر گڑھ کے آثاروں کی دریافت فرانسیسیوں نے کی اگرچہ یہ دریافت انتہائی سنسنی خیز ہے کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حجری عہد میں یہ تمدن تہذیبی طور پر کس قدر ترقی یافتہ تھا لیکن یہ دریافت دنیا کے علمی حلقوں میں تو انتہائی حیران کن ثابت ہوئی مگر پاکستان میں اس کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اس کی دریافت کے جو نتائج برآمد ہوئے تھے ان کی بنیاد پر ہمارے قدیم ماضی کی کوئی تشکیل نہیں ہوئی۔ اتنا ضرور ہوا کہ اخبارات میں اس کے بارے میں چند خبریں چھپ گئیں اور بس۔

اور یہی کچھ ان دریافتوں کا ہے کہ جو جرمن ماہرین نے شمالی علاقہ جات میں کی ہیں' وہاں انہوں نے چٹانوں پر قدیم عہد' اور بودھ دور کی بہت سی تحریروں کو دریافت کیا ہے مگر ہمارے ہاں ان دریافتوں سے کوئی دلچسپی نہیں لی گئی اور یہ تمام دریافتیں اور ان کے نتائج عالموں اور اسکالروں تک محدود ہیں۔

اگرچہ غیر ملکی ماہرین کی وجہ سے نئے آثار دریافت تو ضرور ہوئے ہیں مگر چونکہ ان میں پاکستانی ماہرین کی شرکت یا تو سرے سے ہی نہیں یا برائے نام رہی اس لئے ان دریافتوں کو ہم اپنے قومی مفادات میں استعمال نہیں کیا۔اس کے مقابلہ میں غیر ملکی ماہرین کی دلچسپیاں بالکل مختلف ہوتی ہیں وہ ان دریافتوں کے ذریعہ اپنے نظریات اور تھیوریز کو ثابت کرنا چاہتے ہیں اس کے بعد وہ انہیں غیر محفوظ چھوڑ دیتے ہیں اور ہمیں ان سے یہ توقع بھی نہیں کرنی چاہئے کہ وہ ہمیشہ ان کی حفاظت کریں یہی وجہ ہے کہ میر گڑھ آثار آہستہ آہستہ ختم ہورہے ہیں۔ محکمہ آثار قدیمہ کو نہ تو ان سے دلچسپی ہے اور نہ ہی اس کے پاس ذرائع ہیں کہ وہ ان کو محفوظ رکھ سکے۔

چونکہ آثار قدیمہ کی دریافتوں اور ان کے نتائج سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا اس لئے ہماری تاریخ غیر مکمل ہے اور اس وجہ سے تاریخ قومی کردار کی تشکیل میں بھی ناکام رہی ہے اس لئے نظریاتی تسلط کو توڑنے کے لئے ضروری ہے کہ آثار قدیمہ کے نتائج کو نصابی کتابوں میں شامل کیا جائے اور انہیں بڑے پیمانے پر عوام میں پھیلایا جائے

ہماری قدیم تاریخی جڑیں ہمیں ایک دوسرے سے قریب لانے اور متحد کرنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔

○

نسلی تضادات

انسانوں میں برادری' خاندان اور قبیلہ کی بنیاد پر تو اختلاف رہے' مگر جب ایک قوم دوسری قوم سے یا ایسی انسانی برادریوں اور گروہوں سے رابطہ کرتی تھی کہ جس کا رنگ' زبان اور جسمانی ساخت ان سے مختلف تھی تو اس پر انہیں تعجب ہوا کہ یہ اختلاف کیوں ہے اور یہ لوگ ہماری طرح کے کیوں نہیں ہیں؟ یہی وہ اختلافات ہیں کہ جنہوں نے آگے چل کر اقوام اور گروہوں کو علیحدہ علیحدہ اقسام و انواع میں تقسیم کردیا اور ہر قوم یا گروہ نے اپنے سے علیحدہ لوگوں کے بارے میں اپنے تاثرات قائم کئے جو آگے چل کر نسلی و قومی تعصبات بنے۔

مثلاً" یونانی اپنے علاوہ دوسری اقوام کو وحشی یا باربیرین (barbaeian) کہتے تھے' یہودی خود کو خدا کی پسندیدہ مخلوق سمجھتے ہوئے دوسروں کو جنٹائل (Gentile) کہتے تھے اور عرب اپنے سوا دوسری اقوام کو عجمی یا گونگا کہتے تھے۔

تاریخ میں مختلف اقوام کے درمیان رابطے یا تو تجارت کی وجہ سے ہوئے یا پھر جنگ و جدل۔ سیاحت بہت معمولی تھی اور ابتداء میں چھپائی کے نہ ہونے کی وجہ سے سیاحوں کے خیالات محدود بھی رہتے تھے۔ اس لئے وہ اقوام کے جنہوں نے دوسرے ملکوں کو فتح کرکے اپنی بڑی سلطنتیں بنائیں جیسے کہ رومی ان کا واسطہ کئی اقوام سے پڑا' یا کہ عرب جن کی سلطنت میں ہر رنگ و نسل کے لوگ تھے اور انہوں نے ان کے بارے میں اپنے تجربات کی بنیاد پر رایوں کو قائم کیا۔ عرب چونکہ اسلام کے اس عقیدے پر ایمان رکھتے تھے کہ تمام انسان آدم کی اولاد سے ہیں اس لئے ان میں رنگ

و نسل کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم کرنے کا مطلب اس عقیدے سے انکار تھا' یہی وجہ تھی کہ ان میں ایسا کوئی خیال نہیں تھا کہ کچھ اقوام محض غلام ہیں اور کچھ کو ان پر حکومت کرنے کا حق ہے لیکن بحیثیت فاتح کے انہوں نے مفتوح اقوام کو خود سے کم تر سمجھا اور جب ان اقوام کے لوگوں کو غلام بھی بنایا تو ان میں برتری کے جذبات اور زیادہ بڑھ گئے۔

تاریخ میں انسانوں کے درمیان سب سے زیادہ فرق رنگ کی وجہ سے رہا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ کالے اور سفید رنگ نے ایک طرف تو انسانوں کو دو بڑے حصوں میں تقسیم کردیا' اس کے بعد ان میں اور زیادہ تقسیم عمل میں آئی۔ جیسا کہ برنارڈلیوس نے اپنی کتاب "مشرق وسطی میں نسل اور غلامی" (۱۹۹۰ء) لکھا ہے کہ عرب ایرانیوں کو سرخ رنگ والے کہتے تھے' بعد میں جب ان کا رابطہ یونانیوں ' ہسپانیوں اور دوسری سفید فام اقوام سے ہوا تو انہیں بھی سرخ رنگ والوں میں شامل کرلیا۔

افریقہ میں شروع میں ان کا رابطہ ایتھوپیا یا حبشہ سے تھا' چونکہ عرب معاشرے میں یہ لوگ بحیثیت غلام تھے اس لئے ان کا سماجی رتبہ گرا ہوا تھا اور انہیں کم تر سمجھا جاتا تھا'لیکن جب افریقہ کے اور حصے فتح ہوئے تو بڑی تعداد میں ان لوگوں کو غلام بنا کر لایا گیا اور مزید درجہ بندی ہوگئی' بلاد سوڈان کا اس وقت مطلب تھا کہ کالے لوگوں کا ملک' یہ تمام کالے لوگوں کے لئے تھا' ان کالوں میں سب سے زیادہ کم تر درجہ زنج کا تھا جو مشرقی افریقہ کے تھے' ان کے مقابلہ میں اہل حبشہ کی عزت تھی۔ ان کالوں کی کثیر تعدد کے آنے کے بعد ان کے بارے میں معاشرے میں جو تعصبات پھیلے وہ اس دور کے عربی ادب میں موجود ہیں۔ مثلاً" ابن قتیبہ (وفات ۸۸۹) نے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ بدصورت اور مسخ شدہ ہیں کیونکہ یہ گرم ملک میں رہتے ہیں یہ گرمی رحم مادر میں ہی ان پر اثر کرتی ہے اور اس سے ان کے بال مڑ کر لچھے دار ہوجاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں عرب کے ایک مشہور ادیب جاحظ (وفات ۸۶۹) نے ان کی تعریف کی ہے اور ان کے بارے میں جو بدصوتی' بیوقوفی اور کم تری کے جو

تعصبات تھے انہیں دور کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ ذہین' خوبصورت اور باوقار ہیں۔

مسلمان علماء نے اکثر اس دلیل کو اختیار کیا کہ خدا کی مخلوق کو رنگ اور جسمانی خصوصیات کی بناء پر برا نہیں کہا جائے بلکہ کسی بھی فرد کو سماج میں اس کے تقوی کی بنیاد پر عزت دینی چاہیے۔ لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اہل افریقہ اپنے رنگ کی وجہ سے سماجی طور پر ابھر نہیں سکے۔ کیونکہ ابن خلدون (وفات ۱۴۰۶) نے بھی کہ جس کا تعلق مغرب یا شمالی افریقہ سے تھا۔ ان کے بارے میں لکھا کہ سیاہ فام اقوام اصولی طور پر غلامی کے لئے تیار ہوتی ہیں کیونکہ ان میں انسانی جذبات کم ہوتے ہیں اور اگر ہوتے بھی ہیں تو جانوروں کی طرح۔

بعد میں عرب اسکالرز نے رنگ کی وجہ ماحول کو بتایا کہ جس کی وجہ سے جلد کا رنگ کوئی شکل اختیار کرتا ہے اور ماحول کی وجہ سے قوموں میں مختلف عادتیں پیدا ہوتی ہیں۔ سرد اور معتدل آب و ہوا میں رہنے والوں کا رنگ صاف ہوتا ہے اور ابن خلدون کی تحریروں کے مطابق خوشی و مسرت گرمی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے' جیسے شراب کی گرمی انسانوں میں مسرت و انبساط کے جذبات پیدا کرتی ہے اور گرم غسل کے بعد انسان کی تھکان دور ہوجاتی ہے۔ لہٰذا اس گرم موسم کی وجہ سے اہل افریقہ یا کالے لوگوں میں خوشی ' رقص اور آہنگ کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔

عرب معاشرے میں اگرچہ رنگ کی بنیاد پر یہ تعصبات تھے مگر ان میں سماجی طور پر ان سے مکمل بائیکاٹ کی پالیسی جیسی کہ جنوبی افریقہ میں اپارتھائڈ کے نام پر اختیار کی گئی اس پر کبھی بھی عمل نہیں کیا گیا' شادی بیاہ سے لے کر کالی رنگت والوں کو ان کی صلاحیتوں کی بنیاد پر اعلیٰ عہدے دیئے گئے ہیں۔ اور اسی لئے ان میں گورنر' فوج کے جنرل اور اعلیٰ عہدے دار گزرے ہیں۔

یورپی اقوام بھی اس وقت اس عمل سے گذریں جب کہ ان کے دوسری اقوام سے تجارتی رابطے ہوئے انہوں نے ان سرزمینوں کو دریافت کیا کہ جو اب تک چھپی

ہوئی تھیں یا جن کے بارے میں بہت کم معلومات تھیں اور جب انہوں نے افریقہ اور ایشیا میں اپنی نو آبادیات قائم کیں تو اس صورت میں دوسرے رنگ و نسل کے لوگوں سے ان کا گہرا رابطہ پڑا۔ اس کے نتیجہ میں انہوں نے اس فرق کو محسوس کیا کہ جو ان میں اور دوسری قوموں میں تھا اور یہی وہ مرحلہ تھا کہ جب انہیں اپنی علیحدہ شناخت کا احساس ہوا اور اس کے ساتھ ہی انہوں نے تہذیب و تمدن اور ثقافت میں بھی دوسری اقوام کو خود سے مختلف پایا۔ اس لئے انہوں نے ان اقوام کے بارے میں اپنے پہلے تاثرات کی بنیاد پر رائے قائم کی۔

مثلاً" جب بحر اوقیانوس اور امریکہ کے باشندوں سے ان کا رابطہ ہوا تو انہوں نے پہلے پہلے انہیں شریف وحشی (Noble Savage) کہا جو کہ اگرچہ تہذیب وتمدن میں تو پس ماندہ تھے مگر سیدھے' سادھے اور بے ضرر انسان تھے جب بعد میں مشنری ان ملکوں میں گئے تو انہوں نے ان لوگوں کو مذہبی نقطہ نظر سے جانچا پرکھا اور ان کے عقائد کی وجہ سے انہیں جاہل اور گمراہ کہا۔ جب سفید فام اقوام نے یہاں سیاسی اقتدار قائم کرکے ان لوگوں کو اپنی رعایا بنایا اور ان کے قدرتی ذرائع و دولت کو لوٹنا شروع کیا تو انہوں نے ان اقوام کو پس ماندہ ' غیر متمدن اور وحشی کہہ کر تمام مظالم کو جائز سمجھا اور یہی صورت حال آگے چل کر ایشیا و افریقہ کے ملکوں میں ہوئی۔

اگرچہ سفید فام اقوام جنہوں نے ان ملکوں میں اپنی نو آبادیات قائم کیں وہ عیسائی تھیں اور بحیثیت عیسائی کے ان کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ تمام انسانی مخلوقات حضرت آدم کی اولاد ہے لہٰذا ان میں فرق رکھنا صحیح نہیں ہے۔ لیکن اس وقت سفید فام اقوام کی سیاسی ضرورت تھی اور یہ ان کے مفاد میں تھا کہ اس فرق کو قائم رکھا جائے اور اس کی بنیاد پر ان کا استحصال کیا جائے۔ اس لئے اس عقیدے سے انحراف کے مختلف طریقے اختیار کئے گئے مثلاً" ۱۵۲۰ء میں پار اسیل سس (Paracelsus) نامی ایک شخص نے کہا کہ حضرت آدم صرف یہودیوں کے جد امجد تھے لہٰذا اس خیال کو بعد میں دھرایا گیا تاکہ نسلوں اور اقوام کے فرق کو برقرار رکھا جاسکے۔

یہ فرق تو برقرار رہا' مگر اس کا ایک اثر ضرور ہوا کہ یورپ میں اس پر بحث و مباحثہ شروع ہوگیا اور عالموں و اسکالرز نے اس کے مختلف پہلوؤں پر تحقیق شروع کردی' اگرچہ یہ تحقیق اس وقت ان کے مفادات کو پورا کرتی تھی مگر یہ تحقیق ایک جگہ رک کر نہیں رہ گئی۔ ایک نظریہ کے بعد دوسرا نظریہ پیدا ہوتا رہا اور قوموں و نسلوں کے بارے میں معلومات آگے بڑھتی رہیں یہاں تک کہ آج کے دور میں اس کے سائنسی و سماجی و ثقافتی پہلو تحقیق کے نتیجہ میں سامنے آچکے ہیں۔ نظریات کے اس سفر کی پوری تاریخ مائیکل بینٹون (Michael Bauton) نے اپنی کتاب "نسلی نظریات (۱۹۹۲ء) میں تفصیل سے بیان کی ہے۔ کہ ابتداء میں یورپی اقوام کو اس پر تعجب تھا کہ آخر انہوں نے کیونکہ ٹیکنالوجی میں اس قدر ترقی کرلی ہے جب کہ دوسری اقوام ان کے مقابلہ میں اس قدر پسماندہ ہیں اس کی وجہ سب سے پہلے ماحول کا فرق نظر آیا کہ جس کی وجہ سے قوام کی عادات تشکیل ہوتی ہیں' اس نے اس سوال کو بھی پیدا کیا کہ کیا وہ یورپی جو امریکہ اور افریقہ میں آباد ہوئے ہیں کیا ماحول کی وجہ سے وہ آگے بھی چل کر مقامی باشندوں کی طرح ہوجائیں گے؟

آب و ہوا کے نظریہ میں نئی جہتیں اس وقت پیدا ہوئیں کہ جب افریقیوں کی بڑی تعداد کو امریکہ میں بطور غلام لے جایا گیا۔ یہاں پر یہ تجربہ ہوا کہ کچھ بیماریاں ایسی ہیں کہ جو صرف افریقیوں کو ہوتی ہیں اور کچھ سفید فام لوگوں کو اور کچھ ریڈ انڈین کو لہٰذا اس کا تعلق کچھ لوگوں نے خون سے بتایا مثلاً" اگر کسی کالے میں تھوڑا سا خون سفید فام میں ملا دیا جائے تو اس کی وجہ سے وہ پیلے بخار سے نجات پاسکتا ہے۔

کیا سفید فام' کالوں اور بھورے لوگوں کے خون میں فرق ہوتا ہے اور کیا اگر یہ خون مل جائے تو اس سے کسی قوم کی خصلت بدل جاتی ہے؟ اس پر ایک اسکالر جس کا نام نوٹ (Nott) تھا ۱۸۴۲ء میں ایک مقالہ لکھا جس میں اس نے یہ ثابت کیا کہ میکسیکو میں جو سفید فام لوگ آباد ہیں ان میں اطالوی ' پرتگیزی اور ہسپانوی شامل ہیں کہ جن کا رنگ زیادہ سفید نہیں۔ اس لئے ان کا خون افریقہ یا مقامی باشندوں سے مل

سکتا ہے مگر اینگلو سیکسن جو زیادہ تر سفید ہوتے ہیں ان کا خون ان سے نہیں مل سکتا۔

نوٹ نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ سفید اقوام کہ جن کا تعلق کاکیشین نسل سے ہے وہ ہر زمانہ میں حکمران رہی ہے کیونکہ یہ لوگ بہادر' ہمت والے' مہم جو اور تہذیب کو آگے بڑھانے والے ہیں اس کے علاوہ ان لوگوں میں جمہوری روایات رہی ہیں اس کے مقابلہ میں کالی جلد والے فوجی اور مطلق العنان حکومتوں میں رہنے کے عادی ہیں۔ نوٹ اس بات کو اچھا سمجھتا ہے کہ مختلف نسلوں کو آپس میں ملنا چاہئے کیونکہ اس سے ان میں تبدیلی آئے گی۔ سفید فام کے خون کے ایک قطرہ سے کالوں کی نسل کو ذہین بنایا جاسکتا ہے۔ اسی طرح سے کالوں کا خون سفید فاموں کو بیماریوں سے محفوظ رکھے گا۔ نوٹ کے یہ خیالات خصوصیت کے ساتھ امریکی معاشرے کے لئے ضروری تھے کہ جہاں سفید فاموں کے ساتھ ساتھ افریقی اور ریڈ انڈین بھی تھے اور جن میں پابندیوں کے باجود سماجی رابطے ہورہے تھے۔ لہٰذا نوٹ کے اس نظریہ کے تحت اس محدود نسلی ملاپ میں فائدے تھے۔

انیسویں صدی میں فرانس' برطانیہ اور دوسری اقوام نے ایشیا و افریقہ کے ملکوں میں اپنی نو آبادیات قائم کیں تو اس نے نسل پرستی کے نئے نظریات کو پیدا کیا۔ فرانس سے آرتھر دو گوبینو (Gobineau) نے آریہ نسل کی برتری کا نظریہ پیش کیا کہ جنہوں نے دنیا کی بڑی تہذیبیں پیدا کیں۔ اس کے کہنے کے مطابق تاریخ سے جو سبق ملتا ہے وہ یہی ہے کہ دنیا کی تمام تہذیبیں سفید فام اقوام کی پیدا کردہ ہیں اور یہ بھی ثابت ہوچکا ہے کہ کوئی بھی تہذیب ان کی مدد کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی ہے' اس کے علاوہ کوئی بھی معاشرہ اس وقت تک عظیم اور شاندار ہے کہ جب تک اس کے شریف خون والے گروپوں نے' کہ جنہوں نے اس تہذیب کو پیدا کیا' اپنے خون کو خالص رکھا' اس کے نظریہ کے تحت تہذیبوں میں اس وقت زوال آتا ہے کہ جب سفید فام نسل دوسری کم تر نسل سے ملاپ کرلیتی ہے اور زوال پذیر تہذیب دوبارہ سے اس وقت زندگی حاصل کرسکتی ہے جب اس میں ہجرت کرکے دوسری آریائی اقوام آئیں اور اپنی

توانائی سے اس تہذیب کو زندہ کریں۔

ایک برطانوی عالم چارلس ہلٹن اسمتھ (۱۸۵۹ء) نے نسلی تضادات کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ اگرچہ نسل ایک ہی ہے مگر وقت کے ساتھ یہ تین قسموں میں تبدیل ہوگئے الجھے بالوں والے نیگرو' بغیر داڑھی کے منگول اور داڑھی والے کا کیشین ان میں سب سے زیادہ برتر نسل کاکیشن کی ہے کیونکہ ان میں اتنی توانائی اور حوصلہ ہوتا ہے کہ یہ ہر قسم کی آب و ہوا اور گرمی و سردی کو برداشت کرسکتے ہیں یہ ہجرت کرتے ہیں فتوحات کے بعد نو آبادیات کی بنیاد ڈالتے ہیں اپنی آبادی بڑھاتے ہیں اور یہ وہ واحد نسل ہے کہ جس نے آزاد اور مقبول اداروں کی بنیاد ڈالی ہے۔ یہ آسمان پر تو کیا زمین کی گہرائیوں میں اترا اور اس نے دنیا کے تمام مذاہب کی بنیاد ڈالی۔

جب کہ اس کے مقابلہ میں کالے رنگ کی نسل کے بارے میں اس کا کہنا تھا کہ :
یہ اس لئے کم تر ہیں کیونکہ ان کا دماغ چھوٹا ہے اس لئے ان میں سوائے غلام بننے کے اور کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ ایک اور اسکالر کارل فوگٹ (Vogt) نے یہ دلیل دی کہ کالوں کا ذہنی ارتقاء ابتداء میں رک جاتا ہے لہٰذا انہیں بگڑے ہوئے بچے سمجھنا چاہئے اور ان کے ساتھ اسی طرح کا سلوک کرنا چاہئے۔

۱۸۵۰ء کی دھائی تک نسل کے بارے میں یورپ میں جو نظریات مقبول عام تھے وہ یہ کہ تمام انسان ایک ہی نسل سے ہیں 'مگر بعد میں یہ بچھڑ کر کئی نسلوں میں بٹ گئے' ان کے اختلافات میں ان کے ماحول اور آب و ہوا کا بھی بڑا دخل ہے اور یہ کہ مختلف انسانی نسلوں میں جو سماجی اختلافات ہیں یہ زمانہ قدیم سے ہیں۔

ڈارون نے اپنے نظریہ ارتقاء میں ان دونوں نظریات کو ملا دیا اس کی تھیوری کے مطابق۔

۱۔ دنیا ایک جگہ ٹھہری ہوئی نہیں بلکہ مسلسل متحرک ہے۔
۲۔ انسان کی ابتداء ایک ہی جد امجد سے ہوئی' مگر بعد میں مسلسل عمل سے یہ کئی قسموں میں بٹ گئے۔
۳۔ ارتقاء مرحلہ وار ہوتا ہے' ایک انسانی نوع اچانک دوسری ترقی یافتہ نوع میں

تبدیل نہیں ہوتی ہے۔

۴۔ کئی انواع یا نسلوں سے مل کر ایک نئی نوع پیدا ہوتی ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایک ہی قسم کی نوع مختلف ماحول اور آب و ہوا میں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے مختلف ہو جائے۔

۵۔ ارتقاء نیچرل اور سلیکشن کے نتیجہ میں ہوتا ہے اس عمل میں وہ خصوصیات جو ماحول سے مطابقت نہیں رکھتی ہیں وہ آہستہ آہستہ ختم ہو جاتی ہیں۔

ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو کچھ سوشل ڈارون ازم کے لوگوں نے اپنے نسل پرستانہ مفادات کے لئے استعمال کیا۔ اور اس کے ذریعہ یہ ثابت کیا کہ ہر نسل اپنے وجود کے لئے جدوجہد کرتی ہے اور اس عمل میں بے رحمانہ مقابلہ ہوتا ہے لہٰذا جو نسل طاقت ور ہوتی ہے وہی کامیاب رہتی ہے اور کمزور نسلیں اس عمل میں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ نظریہ نہ صرف نو آبادیاتی دور میں یورپی سفید اقوام کے مفاد میں تھا بلکہ امریکہ میں جہاں کئی نسل کے لوگ تھے اس سے سفید فاموں کو برتری حاصل ہوتی تھی۔ اس لئے رنگ کی بنیاد پر نسلی فرق کو برقرار رکھا گیا۔

موجودہ زمانے میں نئی تحقیق کے نتیجہ میں نسلی برتری کے تصورات کمزور ہو گئے ہیں کیونکہ یہ ثابت ہو گیا ہے کہ نسلی ترقی کا انحصار مواقع پر ہے۔ اور یہ کہ کوئی بائیولوجیکل یا جنیٹک فرق نہیں ہے کہ جو نسلوں کو برتر یا کم تر بناتا ہے۔

اب نسل کے اس نظریہ کو چیلنج کیا گیا ہے اور اس کی جگہ اتھنک (Ethnic) گروپ بندی نے لے لی ہے۔ تاکہ معاشروں میں جو فرق ہے اس کی بہتر طور پر تشریح کی جاسکے' اس کے تحت اب تفریق بائیولوجیکل نہیں بلکہ سوشیولوجیکل ہے یہ اتھنک گروپ زبان' ثقافت ' رنگ ' جغرافیائی تعلق اور مذہب کی بنیادوں پر بنتے ہیں۔ اتھنک گروپ کی تشکیل کے وقت ان خصوصیات کو مدنظر رکھتے ہوئے جو ان سے مشابہت نہیں رکھتا ہے اسے علیحدہ کر دیتے ہیں۔ لیکن گروپ میں شمولت یا اس سے علیحدگی کا سلسلہ جاری رہتا ہے اگرچہ ہر گروپ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنی حدود متعین کر لے اور اپنے حامیوں کو ان حدود میں رہ کر انہیں متحد کرے۔ یہ حدود

برابر بدلتی رہتی ہیں۔ مثلاً" تجارت اور ثقافتی رابطوں کی وجہ سے یہ کمزور ہوتی ہیں اور ایک گروپ کے افراد اپنے مفادات کے لئے دوسرے سے اتحاد کرتے ہیں۔ لیکن اگر گروپ کا بحیثیت مجموعی استحصال ہو تو اس صورت میں یہ اپنے لوگوں کو حدود میں داخل کرکے ان میں اتفاق پیدا کردیتا ہے۔

یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک ایسے معاشرے میں جہاں کئی اتھنک جماعتیں ہوں وہاں انفرادی طور پر لوگ مراعات یافتہ گروپ سے تعلق رکھنا چاہتے ہیں اور اگر انہیں وہاں فائدہ ہو تو وہ اپنی جماعت چھوڑنے پر تیار ہوجاتے ہیں یا ان کے تعلقات کمزور ہوجاتے ہیں۔ مثلاً" نو آبادیاتی دور میں برطانیہ نے حکومت کے ساتھ تعاون کے لئے ایسے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔

لہٰذا اتھنک گروپ اس صورت حال سے نمٹنے کے لئے غدار کے تصور کو ابھارتے اور ایسے افراد جو اس کے مفاد کے برخلاف ہوں انہیں غدار کہہ کر ان کا سماجی بائیکاٹ کیا جاتا ہے یا انہیں معاشرے میں برا سمجھا جاتا ہے اس لئے اگر اس صورت میں نظام میں زیادہ سے زیادہ افراد کو سمونے کی صلاحیت ہوتی ہے تو ایسے غداروں کی تعداد بڑھتی رہتی ہے اور اینتھک جذبہ کمزور ہوتا چلا جاتا ہے۔

یہ صورت حال ہندوستان میں مسلمانوں کی ہے کہ جو اپنی مذہبی شناخت کو سیکولر انڈیا میں برقرار رکھنا چاہتی ہے' اس سلسلہ میں سیکولر مسلمان جو نظام میں ضم ہوجاتے ہیں انہیں مسلمان جماعت کا غدار کہا جاتا ہے۔ اگر ہندوستان کا نظام لوگوں کو زیادہ سے زیادہ ضم کرے تو اس کے ساتھ ہی یہ مذہبی شناخت کمزور ہوگی ورنہ یہ طاقت ور ہوکر لوگوں کو اپنی حدود میں قید کرلے گی۔

جب یہ صورت حال ہو تو خوش حال افراد اس اتھنک شناخت سے دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر جب وہ اپنی اولاد کے مستقبل جائیداد کے تحفظ' ملازمت کے حصول اور ترقی کے بارے میں سوچتے ہیں تو انہیں اپنی حفاظت کے لئے اتھنک جماعت میں شامل ہونا پڑتا ہے اگرچہ یہ شمولیت ان کے طبقہ کی برتری کو ختم کردیتی ہے مگر ایسا وہ مجبوری میں کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ جب اتھنک گروپ اپنی حدود کو مضبوط کرلیتا ہے اور اس میں افراد کو شامل کرکے اس سے باہر نکلنے کا راستہ بند کردیتا ہے تو اس مرحلہ پر ہر فرد کی وابستگی اپنے گروپ سے گہری ہوتی چلی جاتی ہے اور وہ اپنی ذات کو گروپ کی ذات سے ملا دیتا ہے اور جس قدر وہ گروپ کی ذات میں گم ہوتا جاتا ہے' اسی قدر وہ اپنے رویہ اور سوچ میں انتہاء پسند ہوتا چلا جاتا ہے اور اپنے گروپ کے لئے ہر قسم کی قربانی کے لئے تیار ہوجاتا ہے۔ اس کی اخلاقیات وہ ہوتی ہیں کہ جس سے اس کے گروپ کو فائدہ ہو اور جو بھی دوسرا گروپ دشمن کے طور پر آتا ہے وہ اسے ختم کرنے کے لئے تیار ہوجاتا ہے۔ اس میں اس کے لئے کوئی قانون و غیر قانونی تصور نہیں ہوتا ہے۔ صرف اپنے گروپ کی بقا اور برتری کا سوال ہوتا ہے۔ اس لئے اگر وہ اپنے دشمنوں کو قتل کرتے ہیں ان کی عورتوں کی عزت لوٹتے ہیں اور ان کے مکانوں کو جلاتے ہیں تو یہ سب اس گروپ کے مفاد میں صحیح ہوتا ہے' اسی لئے لٹیرے' قاتل اور خونی اتھنک گروپ میں ہیرو بن جاتے ہیں اور اس کی حدود میں ان کی بڑی عزت ہوتی ہے۔

اس کی مثالیں ہمیں پاکستان کے معاشرے میں بھی ملیں گی' جہاں لسانی اور مذہبی گروپ بنے ہوئے ہیں اور انہوں نے اپنے حامیوں کو اپنی حدود میں محصور کرکے ان کے ذہنوں کو بدل دیا ہے اور یہی چیز عالمی سطح پر دیکھنے میں آئے گی۔ سری لنکا میں تامل اور سنہالی جھگڑے ہیں اور بلقان میں سربوں اور بوزنیا کے لوگوں کے درمیان' جہاں اتھنک جذباتیت و تشدد پسندی اپنے عروج پر ہے۔

نسل پرستی اور اتھنک تقسیم کے بارے میں اب تک جو نظریات تشکیل دیئے گئے انہوں نے بہت سے قدیم روایتی مفروضوں کو ختم کیا اور حقیقت کو سامنے لے کر آئے۔ لہٰذا اس وقت بھی اتھنک ذہنیت کو سمجھنے کے لئے نظریات کی ضرورت ہے اور جب ہم اس کی وجوہات کو سمجھ لیں گے تو اس صورت میں اس کے علاج کی طرف بھی قدم اٹھائے جاسکیں گے۔

○

اسلام اور جدیدیت

مسلمان معاشرہ میں جب کبھی جدیدیت کی بات ہوتی ہے تو اس سے ہمیشہ یہ مراد لی جاتی ہے کہ معاشرہ میں مغربی روایات یا یورپی نظام کو رائج کیا جارہا ہے۔ للذا اس کے نتیجہ میں فوری رد عمل یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ کو یورپی بنانے کا عمل نہ صرف ہماری روایات کے خلاف ہے' بلکہ یہ ہماری شناخت کو ختم کرنے کی ایک سازش ہے' للذا اس عمل کا مقابلہ کرنے کے لئے مقامی روایات اور اداروں کے احیاء کی کوششیں شروع ہوجاتی ہیں۔

یورپی یا جدیدیت کے اس عمل سے مسلمان معاشرے اس لئے بھی شک و شبہ میں مبتلا ہوتے ہیں' کیونکہ ایک طویل عرصہ تک یورپی ممالک نے انہیں اپنی نو آبادیاں بنائے رکھا تھا اور اس عرصہ میں یورپی روایات کو روشناس کراتے ہوئے انہوں نے مقامی کلچر پر کاری ضربیں لگائی تھیں' اس لئے ان ملکوں میں ڈر یہ ہوتا ہے کہ جدیدیت کے اس عمل میں یورپ اب ایک نئے طریقے سے انہیں دوبارہ سے اپنی نو آبادیات بنانا چاہتا ہے۔

اس کے علاوہ جدیدیت صرف سائنس اور ٹیکنالوجی ہی میں نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ نئے سماجی اور اخلاقی روایات اور رویے بھی آرہے ہیں جو ہماری ثقافت سے اس قدر مختلف ہیں کہ ان کے خلاف ایک زبردست رد عمل نہ صرف مذہبی حلقوں میں ہے بلکہ قدامت پرست بھی ان کو اپنے کلچر کے لئے نقصان دہ سمجھتے ہیں اور کسی بھی قسم کی تبدیلی کے سخت مخالف ہیں۔

اس صورت حال میں مسلمان ملکوں میں جدیدیت کے خلاف یا اس کی حمایت میں تین رجحانات ہیں' جدیدیت کے اس عمل کو بالکل روک دیا جائے' اور اس کی بجائے اپنی مقامی روایات کا احیاء کرکے دوبارہ سے ماضی کی شان و شوکت حاصل کی جائے' جدید روایات کو اسلامی روایات سے ہم آہنگ کرکے انہیں مسلمان بنایا جائے' اور پھر انہیں اختیار کیا جائے تو اس پر اعتراض کی گنجائش نہیں ہوگی' مذہب کو بالکل سیاست سے جدا کردیا جائے۔ کیونکہ یہ جدیدیت اور ترقی کے راستہ میں ایک رکاوٹ ہے' اس کے بعد مغربی روایات کو اختیار کرکے معاشرے کے سیاسی و معاشی نظام کو اس خطوط پر ہموار کیا جائے۔

بہت سے مسلمان ملکوں میں نو آبادیات کے خاتمہ کے بعد اس بات کی کوشش ہوئی تھی کہ مغربی اور مقامی اداروں کو ملا کر ایک جدید نظام تشکیل دیا جائے' اس لئے خاص طور سے اسلام کا ایک ترقی پسند نقطہ نظر پیش کیا گیا کہ جس نے جمہوریت' سوشل ازم' قوم پرستی اور سرمایہ داری کو اسلامی فریم ورک میں ڈھال کر اسے قابل قبول بنانے کی کوشش کی' لیکن ہوا یہ کہ یہ تمام اصلاحات آمرانہ' فوجی اور مطلق العنان حکومتوں کے ذریعہ نافذ کی گئیں۔ اور انہوں نے ان کے ذریعہ اپنے اقتدار اور اختیارات کو وسیع کرنا چاہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ اصلاحات لوگوں کی سماجی حیثیت کو نہ تو بڑھا سکیں' اور نہ ان کے معاشی مسائل کو حل کرسکیں' لہٰذا لوگوں نے اوپر سے نافذ کی ہوئی ان اصلاحات کو رد کردیا۔ اس ناکامی کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں یہ احساس ہوگیا کہ جدیدیت صرف حکمران طبقوں کو فائدہ پہنچاتی ہے اور اس سے عام لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے۔ اس لئے ان میں مغرب کے خلاف جذبات اور جدیدیت کے خلاف ایسا رد عمل ہوا کہ اس کے متبادل نظام کے لئے انہوں نے احیاء کی تحریکوں کا ساتھ دینا شروع کیا۔

جدیدیت کے عمل کو ہم دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں : سائنس اور ٹیکنالوجی کا عمل' اور سیاسی و سماجی اور معاشی خیالات و نظریات' اس سلسلہ میں اہم اور خاص بات

یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے بارے میں ابتداء میں جو رویے تھے وہ تبدیل ہوگئے ہیں' اور اس کی مخالفت کی جگہ اب اس کو اختیار کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں رہی ہے' ایک زمانہ تھا کہ ہر جدید ٹیکنالوجی اور ایجاد کی مخالفت کی جاتی تھی اور اسے اسلام کے خلاف سمجھا جاتا تھا جیسے کیمرہ' ریڈیو اور لاؤڈ اسپیکر' بجلی ٹائپ رائٹر اور مختلف دواؤں کا استعمال' لیکن آہستہ آہستہ ان ایجادات کو اس لئے قبول کرلیا گیا کہ کیونکہ انہوں نے معاشرہ کو سہولتیں پہنچائیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب جو نئی ایجادات آرہی ہیں جن میں کیسٹ' ویڈیو' ٹی وی' وی سی آر اور ایئر کنڈیشن شامل ہیں' ان کی کوئی مخالفت نہیں ہے اس لئے کہ ان سے سب کو آرام ہے۔ اب ان کے استعمال پر کوئی مذہبی فتوے نہیں لگتے ہیں۔ اس لئے جہاں تک سائنس و ٹیکنالوجی کے جدید عمل کا تعلق ہے اسے مسلمان معاشرے میں تسلیم کرلیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ سعودی عربیہ جیسا قدامت پرست ملک اب نئی ٹیکنالوجی کو جدیدیت کے نام پر حاصل کر رہا ہے۔ اور یہی کام شاہ ایران نے اپنے زمانہ میں کیا تھا' مگر سعودی عرب کی طرح اس نے بھی اپنے معاشرے کے سیاسی و سماجی حالات کو بدلنے پر صرف ٹیکنالوجی کے ذریعہ جدیدیت کو اختیار کیا تھا۔ ان دونوں ملکوں میں اس کی وجہ سے معاشرہ پر تباہ کن اثرات ہوئے۔ ایران میں تو شاہ کی حکومت کا خاتمہ ہوا اور اس کی جگہ بنیاد پرستی نے لی لے' سعودی عربیہ اس تبدیلی کے عمل سے تو نہیں گذرا' مگر اس کا معاشرہ ٹیکنالوجی کے دور میں ایک ایسا معاشرہ ہے کہ جہاں نہ کوئی کلچر ہے اور نہ زندگی کی رنگینی۔

وہ مسلمان دانشور کہ جو جدیدیت کے عمل کی مخالفت کرتے ہیں' ان کے لئے مسئلہ یہ ہے کہ اگر وہ اس کو رد کرتے ہیں تو انہیں اس کا کوئی متبادل نظام تجویز کرنا ہوگا اس لئے اکثر وہ اس کا آسان حل یہ ڈھونڈتے ہیں کہ سیاسی' سماجی اور معاشی اداروں کو اسلام کے مطابق بناتے ہیں' جیسے پارلیمنٹ کے لئے شوریٰ' یا رائے کو اجماع اور صدر حکومت کو خلیفہ یا امیر بنا کر وہ ان کی اسلامی شکل بنا دیتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ ان اصطلاحات کے آگے اسلامی کا لفظ لگا کر اسے اپنا لیتے ہیں' جیسے اسلامی معیشت' اسلامی

نفسیات' اور اسلامی سوشل ازم لیکن اب تک انہوں نے ایسا کوئی جامع نظام تشکیل نہیں دیا ہے کہ جو معاشرے کی سیاسی' معاشی اور سماجی ضروریات کو پورا کرے اور موجودہ دور کے تقاضوں سے عہد بر ہو سکے۔

جہاں ایک طرف مسلمان معاشرہ نے جدیدیت کو اختیار کرنے کی مخالفت کی ہے' وہاں یورپی دانشوروں کے رویہ کی وجہ سے بھی اس عمل کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ باسم طبی نے اپنی کتاب "جدید اسلام کا بحران" (۱۹۸۸ء) میں یورپی دانشوروں پر تنقید کرتے ہوئے نشان دہی کی ہے کہ جو جدید قدروں اور روایات کو یورپی سمجھ کر ان پر اپنی اجارہ داری قائم کئے ہوئے ہیں اور جب دوسرے غیر یورپی ممالک جدیدیت کو اختیار کرتے ہیں تو یہ اسے مغربی تہذیب کی فتح قرار دیتے ہیں۔ اس لئے جب یہ کہا جائے کہ ہماری تہذیب سب سے اعلیٰ و ارفع ہے تو اس کے رد عمل میں مسلمان کہتے ہیں کہ ہم کیوں اس تہذیب کو اختیار کریں جب کہ ہم نے اس سے بہتر تہذیب تشکیل دی ہے؟ اس رویہ سے ان کی انا پر چوٹ لگتی ہے اور ان کا وقار مجروح ہوتا ہے۔

لہٰذا یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ ان حالات میں کیا کیا جائے؟ کیسے جدید تقاضوں کو پورا کیا جائے؟ اور کس طرح سے پس ماندگی کو دور کیا جائے؟ اور کس طرح سے مغربی دانشورانہ چیلنجوں سے نمٹا جائے؟ فواد عجمی نے اپنی کتاب "The Arad Predicament" میں اس صورت حال پر لکھا ہے کہ دنیا کی قوموں میں اپنی پس ماندگی کو دیکھتے ہوئے' انہوں نے کبھی اس بات کی کوشش کی کہ مغرب سے کچھ سیکھا جائے اور اس کی طرح اسی ماڈل پر ترقی کی جائے' کبھی انہوں نے اس سے مایوس ہو کر اپنی ہی دنیا میں پناہ لی' تاکہ اپنی روایات' قدروں اور اداروں میں پناہ لے سکیں اور خود میں یہ اعتماد پیدا کر سکیں جرات کے ساتھ ان لوگوں سے بغاوت کر سکیں اور ان کی مزاحمت کر سکیں کہ جو ان کے بارے میں فیصلے صادر کرتے ہیں۔ لیکن پر کشش اور شاندار دنیا میں داخل ہونا بھی اس قدر مشکل ہے کہ جس قدر ~~اس~~ سے باہر آنا۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ پورا معاشرہ بے ترتیبی اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گیا ہے۔

اس لئے مسلمان ملکوں کے لئے اس وقت یہ مرحلہ ہے کہ خود کو اس ٹوٹ پھوٹ سے کیسے بچائیں؟ خاص طور سے اس صورت میں کہ جب اسلام کو ایک سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جارہا ہے۔ اس لئے مسلمان ملکوں کے دانشوروں کے لئے ضروری ہے کہ وہ روایات کو توڑیں کہ معاشرے میں حقیقت بن کر پیوست ہوئی ہیں۔ اور جس میں یہ سمجھا جارہا ہے کہ ہمارا نظام مکمل اور ناقابل تسخیر ہے۔ لیکن جب تک تبدیلی کے عمل کو تسلیم نہیں کیا جائے گا' اس وقت تک ہم سائنس و ٹیکنالوجی اور نئے سماجی و معاشی نظریات کو قبول نہیں کریں گے۔

اسلام کو سیکولر بنانا

اس وقت دنیا دو قسم کے ملکوں میں بٹی ہوئی ہے۔ ایک صنعتی اور دوسرے غیر صنعتی اسی لحاظ سے ان دونوں قسم کے ملکوں میں علیحدہ علیحدہ کلچر کا ارتقاء ہوا ہے۔ یورپی ممالک صنعتی کلچر کی نمائندگی کرتے ہیں' اس کلچر کی وجہ سے ان کے معاشرے میں سیاسی' معاشی اور سماجی تبدیلیاں آئیں اور مذہب سیاست سے جدا ہوکر نجی زندگی میں محدود ہوگیا۔ اس کی وجہ سے یہاں سیاست میں مذہب کا استعمال کم سے کم ہوگیا اور جمہوریت کی جڑیں انتہائی مضبوط ہوگئیں۔ اس کے مقابلہ میں غیر صنعتی کلچر میں مذہب اور سیاست آپس میں باہم ملے ہوئے ہیں' جس کے نتیجہ میں یہاں سیاسی اتھارٹی کے لئے مذہب کے ذریعہ اپنے جائز ہونے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اور یہی گٹھ جوڑ ہے جو معاشرہ کو آزاد خیال ہونے سے روکتا ہے اور اس کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کرتا ہے۔

اسلامی دنیا کا تعلق اس غیر صنعتی کلچر سے ہے' اس لئے تمام اسلامی ملکوں میں حکومتیں اسلام کے ذریعہ اپنے جائز ہونے کا جواز نکالتی ہیں اور ہر سیاسی جماعت اقتدار میں آنے کے لئے مذہب کو استعمال میں لاکر لوگوں کے جذبات کو بھڑکا کر انہیں اپنے حق میں ہموار کرتی ہے۔ ان میں ملکوں میں ایسی کم مثالیں ہیں کہ جب کسی فرد نے

مذہب کو سیاست سے جدا کرکے' اصلاحات کا نفاذ کیا۔ مثلاً" ایران میں شاہ نے مذہب کے بغیر جدیدت اور اصلاحات کا سلسلہ شروع کیا' لیکن اس کی صنعتی اور جدیدیت کی پالیسی اس لئے ناکام ہوگئی کہ اس نے اس کے ساتھ لوگوں میں نئے خیالات کو پھیلنے سے روکا دوسرے مذہبی جماعتوں اور علماء نے اس کی مخالفت کی اور اس کی اصلاحات کو اسلام کے خلاف قرار دیا۔ اگر شاہ اپنی اصلاحات کو مذہب سے ملا کر شروع کرتا تو اس کی علماء کی جانب سے اس شدت سے مخالفت نہیں ہوتی' جیسے کہ سعودیہ عربیہ میں شاہی خاندان کر رہا ہے وہ اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے مذہب کو پوری طرح استعمال کر رہے ہیں اور علماء کو اس میں شریک کرر کھا ہے' اس لئے ان کے خلاف مذہبی جذبات نہیں ابھارے جاسکتے۔

صورت حال یہ ہے کہ اکثر مسلمان ملکوں میں جہاں محدود جمہوری حکومتیں ہیں' یا آمرانہ طرز حکومت' ان سب ملکوں میں حکومتیں اپنے اقتدار کو قائم رکھنے کی غرض سے مذہبی جماعتوں کے مطالبات کو تسلیم کرتے ہوئے ان کو اپنی پالیسیوں میں شامل کرلیتی ہیں' اگر ان ملکوں میں سیاسی یا معاشی اصلاحات کا نفاذ بھی ہوتا ہے تو پہلے اسے اسلامی بنانے کے عمل سے گزارا جاتا ہے۔ مثلاً" اسلامی ملکوں میں جمہوریت کا نظام اس وقت بدل جاتا ہے جب یہ کہا جاتا ہے کہ اقتدار اعلیٰ لوگوں کے پاس نہیں ہے بلکہ خدا کے پاس ہے' اس کی وجہ سے جو لوگ حکمران ہوتے ہیں ان کے پاس لامحدود اختیارات آجاتے ہیں کہ وہ جس طرح سے چاہیں لوگوں کو دبا کر اور کچل کر رکھیں کیونکہ اس نظام میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی ہے۔

اس لئے مسلمان ملکوں کی پس ماندگی اس وقت تک رہے گی جب تک کہ وہ غیر صنعتی کلچر سے صنعتی کلچر کے دور میں داخل نہیں ہوں گے اور اس وقت تک اسلام کو بھی صنعتی مغربی ملکوں کی جانب سے خطرہ لاحق رہے گا' لہذا مسلمان ملکوں کے لئے دو صورتیں ہیں: یا تو صنعت و حرفت کو اختیار کرکے اپنے سیاسی و معاشی اور سماجی ڈھانچہ کو بدل ڈالیں اور یا اپنی قدیم روایات پر قائم رہتے ہوئے پس ماندہ رہیں۔

باسم طبی جو ایک شامی ' جرمن اسکالر ہے اس نے اپنی کتاب "جدید اسلام کا بحران" جو ۱۹۸۸ء میں شائع ہوئی ہے' اس میں دلائل دیئے ہیں کہ اسلام کو سیکولر بنانے کی سخت ضرورت ہے۔ اس کی دلیل کے مطابق جدید زمانہ کا تعلق صنعتی دور سے ہے۔

اور یورپ اس وجہ سے ترقی کرسکا کیونکہ اس نے صنعتی انقلاب کو قبول کیا' کیونکہ اس سے پہلے یورپ میں بھی مذہب کا اس قدر اثر تھا۔ سیکولر یورپ میں عیسائیت سیاست سے علیحدہ ہونے کے باوجود خود کو زندہ رکھ سکی۔ اس لئے طبی کی دلیل ہے کہ صنعتی انقلاب اور سائنس و ٹیکنالوجیکل انکشافات اور اس کے نتیجہ میں عقلیت کا جو غلبہ ہوا اس کے باوجود عیسائیت ختم نہیں ہوئی لیکن اس عمل میں مذہب سیکولر ہوگیا اور اس کی حیثیت معاشرہ میں ثانوی ہوگئی۔

طبی اس سے اتفاق کرتا ہے کہ مسلمان ملکوں کے لئے ضروری نہیں کہ اس عمل سے اسی طرح سے گذریں جیسا کہ یورپ لیکن اس کا کہنا ہے کہ سائنٹفک اور ٹیکنالوجی کی بنیاد پر پروان چڑھنے والا کلچر ایک زراعتی اور محدود سرمایہ دارانہ نظام میں پیدا نہیں ہوسکتا ہے۔ اس لئے طبی کے استدلال کے مطابق' مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلام کا ایک ایسا نظام تخلیق کریں کہ جس میں مذہب کی اس جامع نظام میں ثانوی حیثیت ہو' اور وہ اخلاقی دائرہ تک محدود رہے' جب کہ دوسرے شعبے اس سے آزاد ہوں۔ اسی صورت میں مسلمان ملکوں کے لئے ترقی ممکن ہے۔

عرب ملک دوراہے پر

۱۷۹۸ء میں جب نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو اس وقت عرب دنیا اور یورپ میں پہلا رابطہ ہوا' اگرچہ یہ رابطہ بہت کم وقت کے لئے تھا' لیکن نپولین کی فتح مصر اور اس کے ساتھ آنے والے دانشوروں نے اہل عرب کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ یورپی تہذیب اس کی کامیابی اور اس کے مقابلہ میں اپنی شکست اور پسماندگی پر غور کرسکیں۔ آگے

چل کر جب یورپی ملکوں نے عرب ملکوں کو اپنی نو آبادیات بنالیا تو انہیں یورپی تہذیب کو سمجھنے کا اور زیادہ موقع ملا اور عرب سیاست دانوں اور دانشوروں نے اس مسئلہ پر سوچنا شروع کردیا کہ وہ اپنی پسماندگی کو اسی وقت ختم کرسکتے ہیں کہ جب وہ یورپی روایات اور نظام کو اختیار کریں۔

ایک مراکشی اسکالر عبداللہ لاذری نے جدید عرب معاشرہ کے ارتقاء کے چار ادوار مقرر کئے ہیں: پہلا دور ۱۸۵۰ء سے شروع ہوکر ۱۹۴۱ء تک جاتا ہے' اس زمانہ میں مغربی تہذیب اور اس کی روایات کو بڑے جذبہ کے ساتھ اختیار کیا گیا۔ دوسرے دور میں انہوں نے عثمانی خلافت اور اس کی مطلق العنانیت کے خلاف بغاوت کرتے ہوئے عرب قوم پرستی کو ابھارا اور جمہوری اقدار کو فروغ دینے کی کوششیں کیں۔ ۱۹۴۸ء میں تیسرے دور میں عربوں نے آپس میں اتحاد کی کوششیں کیں تاکہ اسرائیل کے قیام سے جو صورت حال پیدا ہوگئی تھی اس کا مقابلہ کیا جائے اور ساتھ ہی نو آبادیاتی نظام کے خاتمہ نے جس نے نئے ملکوں کو جنم دیا اور جغرافیائی حدود کو بدلا' اس سے عہدہ برا ہوا جائے۔ چوتھے دور میں اہم واقعہ ۱۹۶۷ء کی جنگ اور اس میں عربوں کی شکست ہے' اس نے پوری عرب دنیا کو بے بس اور مایوسی کی حالت میں تبدیل کردیا۔ اس شکست کے دو نتائج برآمد ہوئے: اس نے عرب دنیا میں بے چارگی کے احساسات کو پیدا کیا' مگر اس کے ساتھ ہی عرب معاشرہ میں تنقید اور تجزیہ کا عمل بھی شروع ہوا۔ فواد عجمی نے اپنی کتاب The Arab Predicament جو ۱۹۹۲ء میں کیمرج سے شائع ہوئی ہے' اس میں ۱۹۶۷ء کی جنگ کے اثرات اور نتائج سے بحث کی ہے۔ جنگ کی وجہ سے عرب دنیا میں قوم پرستی' سیکولر ازم اور روشن خیالی کو سخت دھچکہ لگا۔ اس ناکامی کے بعد سیکولر سیاسی راہنماؤں نے اپنا موقف بدل لیا' اور اس کی جگہ انہوں نے بنیاد پرستی کو اختیار کرلیا تاکہ اس کے ذریعے وہ اپنے اقتدار کو بچاسکیں۔ اس سلسلہ میں اس نے دلچسپ مثال یہ دی ہے کہ ۱۹۶۷ء کی جنگ پہلے مصر کی فوج میں موسیقاروں اور فلم ایکٹریسوں کی تصویریں فوجیوں میں تقسیم کی گئیں تھیں۔ لیکن جنگ کے فوراً" خاتمہ کے بعد

حکومت کی جانب سے جہاد اور رسول اللہ کی جنگوں کے بارے میں پمفلٹس تقسیم کیے گئے۔ لہٰذا اس شکست نے عرب معاشرہ میں انقلابی تحریکوں کو ختم کردیا اور ان کی جگہ رجعت پرستانہ خیالات حاوی ہوگئے۔ دوسرا اثر یہ ہوا کہ عربوں نے کسی اور کو اپنی شکست کا ذمہ دار ٹھہرانے کی بجائے خود کو مورد الزام ٹھہرایا۔

اس کی ایک مثال دیتے ہوئے عجمی نے لکھا ہے کہ شکست کے بعد عبدالحکیم عامر نے خودکشی کرلی' بہت سے لوگوں کے نزدیک یہ خودکشی ایک عام بات تھی' مگر ایک مصری ادیب نے اسے دوسرے انداز سے دیکھا ہے اور لکھتا ہے کہ "میں نے اس واقعہ کے نتیجہ میں یہ تجزیہ کیا ہے کہ یہ غم و غصہ کے اظہار کی ابتداء ہے جو کہ آگے چل کر قدیم عقائد کو ختم کرکے ان کی جگہ نئی روایات کو پیدا کریں گے۔" عبدالحکیم کی خودکشی سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ذاتی ذمہ داری کا سوال بھی معاشرے میں اہمیت اختیار کرگیا تھا اور اس قسم کا واقعہ اور ذاتی ذمہ داری کے اظہار کا یہ طریقہ مسلمان معاشرہ میں بالکل اچھوتا ہے۔

لیکن شکست کے بعد انقلابی اور ترقی پسند دانشوروں کے خیالات و نظریات عرب معاشرے میں کوئی تبدیلی نہیں لاسکے اور لوگ سیاسی راہنماؤں سے مایوس ہوکر مذہب کی جانب راغب ہوگئے تاکہ وہ مایوسی و پسماندگی سے نکل سکیں اور دنیا میں باعزت مقام حاصل کرسکیں۔

تیل والے عرب ملکوں نے اس صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور ہر جگہ مذہبی تحریکوں کی حمایت کی اور ان کے ذریعہ انہوں نے تمام عرب ملکوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ ان کی پالیسی کو اختیار کریں۔

یہاں سے مایوس ہوکر انقلابی عرب دانشوروں اور لیڈروں نے فلسطین کی تحریک آزادی کی حمایت شروع کی تاکہ اس کے ذریعہ وہ عرب معاشرے کی بے حسی اور لاتعلقی کو ختم کرسکیں۔ لیکن ان کی تمام امیدیں اس وقت ختم ہوگئیں جب کہ ۱۹۷۰ء میں اردن نے فلسطینیوں کا قتل عام کرکے انہیں کمزور کردیا۔ فسلطینیوں کا یہ قتل

عام تمام عرب ریاستوں کی مرضی سے ہوا' کیونکہ وہ ان کی آزادی کو ختم کر کے انہیں اپنے کنٹرول میں لانا چاہتے تھے تاکہ عرب ریاستیں اسرائیل سے بات چیت کر سکیں اور خود اپنے ملکوں میں انقلابی تحریکوں کو کچل سکیں۔

لبنان کی خانہ جنگی نے مزید فلسطینیوں کی طاقت کو کمزور کردیا' اس کے بعد عرب انقلابیوں کے لئے کوئی راستہ باقی نہیں رہا کہ وہ عرب معاشرے کو تبدیل کر سکیں۔ ۱۹۷۳ء کی جنگ کے بعد سادات کا یہ فیصلہ کہ اسرائیل کو تسلیم کرلیا جائے۔ اس نے تمام امیدوں کو ختم کردیا۔ بعد کے واقعات سے یہ ثابت ہوا کہ انقلابی تحریکیں ایک ایک کر کے دم توڑ گئیں۔ کیمپ ڈیوڈ کے معاہدہ' لبنان سے فلسطینیوں کے اخراج کے بعد سعودی عربیہ اور خلیج کی ریاستوں نے بنیاد پرستی کی حمایت کرتے ہوئے عرب ملکوں میں مذہبی جماعتوں کی مالی امداد کر کے انہیں متحرک بنا دیا۔ عرب قوم پرستی کے ختم ہونے کے بعد جو خلا رہ گیا تھا اسے بنیاد پرستی نے جلد پر کرلیا اور لوگ اس امید میں ان کے ساتھ ہوئے کہ انہوں نے انہیں پس ماندگی اور ذلت سے نکالنے کا دعویٰ کیا ہے۔ لہٰذا اس مرحلہ پر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ بنیاد پرستی عربوں کو کہاں سے کہاں لے جائے گی؟ کیا یہ پسماندگی کو دور کر سکے گی اور کیا یہ زمانہ کے تقاضوں کو پورا کر سکے گی۔ عرب دانشوروں نے اس بات کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کے خطرناک نتائج کی نشاندہی کی ہے۔ مگر ان کی اس تنبیہہ کا کوئی اثر اس لئے نہیں ہوا کہ لوگوں کے سامنے کوئی دوسرا متبادل راستہ بھی تو نہیں ہے۔

فواد عجمی نے اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس تاریخی بحران میں پھنسنے کے بعد وہ ان طاقتوں کے وجود سے پریشان ہیں کہ جنہوں نے انہیں اپنے محاصرے میں لے رکھا ہے' لہٰذا ان سے مقابلہ کرنے کے لئے انہوں نے ان علامتوں اور ہتھیاروں کا سہارا لیا ہے کہ جن کے استعمال سے وہ بخوبی واقف ہیں یعنی ان کی مذہبی شناخت مگر اس سوال کا جواب ابھی باقی ہے کہ کیا وہ محض اپنی مذہبی شناخت سے زمانہ کے چیلنجوں کا مقابلہ کر سکیں گے؟

مصراور بنیاد پرستی

یوں تو بنیاد پرستی کی تحریکیں تمام اسلامی ممالک میں ہیں' مگر اس وقت مصر ان تحریکوں کا مرکز بنا ہوا ہے اور جب کہ ان تحریکوں کے کارکنوں نے غیر ملکی سیاحوں پر حملے شروع کئے ہیں اس کے بعد سے تو ساری دنیا کی توجہ اس کی طرف ہے۔ کیونکہ ان کی سرگرمیوں کی وجہ سے ایک طرف تو حکومت بے بس نظر آتی ہے اور ان کے خلاف کوئی موثر اقدامات نہیں کرسکتی ہے۔ دوسری طرف اسی بے بسی کے اظہار کے لئے اس نے تحریکوں کے کارکنوں کو پھانسی دینے کا سلسلہ شروع کیا ہے جو بنیاد پرستی کو کمزور کرنے کی بجائے اسے اور نئی زندگی دے رہا ہے۔

مصر میں ابتداء میں اخوان السلمون ایک بنیاد پرست جماعت کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئی تھی' لیکن وقت کے ساتھ ساتھ اور آہستہ آہستہ اخوان المسلمون نے اپنی پالیسی کو تبدیل کرلیا ہے اور تشدد کو ترک کرکے حکومت کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا ہے۔ لیکن اس سمجھوتہ کے نتیجہ میں ایسی کوئی بھی تبدیلی عمل میں نہیں آئی جو کہ بنیاد پرستوں کو مطمئن کرسکتی۔ بلکہ ملک کے خراب ہوتے ہوئے حالات کی وجہ سے یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اس پر مایوسی ہوئی کہ حکومت ہرلحاظ سے مکمل طور پر ناکام ہوچکی ہے ان حالات میں وہ نوجوان کہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ صرف شریعت کے نفاذ میں مصر کا مستقبل ہے' انہوں نے اخوان کے رویہ سے بد دل ہوکر اپنے علیحدہ علیحدہ چھوٹے چھوٹے گروہ بنانا شروع کرائے تاکہ معاشرہ میں تبدیلی کو لایا جاسکے اور معاشی و سماجی مسائل کو حل کرنے کے لئے اسلامی تعلیمات کو نافذ کیا جائے۔

لہٰذا ان میں جو اہم جماعتیں ہیں وہ یہ ہیں' اسلاملک لبریشن آرگنائزیشن ' تکفیر الہجرہ' الجہاد اور تحریر اسلامی۔ ان تحریکوں کے اہم اور سرگرم نوجوان وہ ہیں جو کہ اپنے بزرگوں سے مایوس ہوچکے ہیں اور جنہیں اصلاحات کی پالیسی سے کوئی امید نہیں ہے اس لئے ان کی شدید خواہش ہے کہ ہر چیز کو کم سے کم وقت میں تبدیل کردیا جائے۔

اس لئے یہ تشدد پر یقین رکھتے ہیں اور اقتدار پر ہر صورت میں قابض ہونا چاہتے ہیں۔

ان کے نظریہ کے مطابق مصر جاہلیت کی حالت میں ہے اور یہاں پر اکثریت پیدائشی مسلمان ہیں جب کہ درحقیقت انہیں اسلامی تعلیمات کے بارے میں کچھ علم نہیں ہے۔ اسلئے تکفیرالہجرہ کا موقف یہ ہے کہ کفر کے اس مرکز سے ہجرت کی جائے' ایک مثالی معاشرہ علیحدہ رہتے ہوئے قائم کیا جائے اور اس کے بعد تمام معاشرہ کو اس میں ضم کرلیا جائے۔ ان کے ذہن میں رسول اللہ کا ماڈل ہے کہ جنہوں نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی اور وہاں ایک مثالی معاشرہ قائم کرکے دوبارہ مکہ واپس آگئے۔

یہ مذہبی جماعتیں تعلیمی اداروں میں سرگرم ہیں کہ جہاں یہ دوسرے طالب علموں کو اپنی تحریک میں شامل کرنے کی کوشش کرتی ہیں ان کی تعلیمات اور نظریات سے عوام متاثر نہیں ہوئے ہیں اور وہ اب تک مذہب کو روایتی انداز سے مانتے ہیں اور اس میں کسی قسم کی انقلابی تبدیلی نہیں چاہتے ہیں۔

بیری روبن (Barry Robin) نے اپنی کتاب "اسلامی بنیاد پرستی مصر کی سیاست میں" جو ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی ہے' اس میں اس نے مصر میں بنیاد پرستی کے مختلف ادوار کا تجزیہ کیا ہے اور یہ کہ اس میں اور دوسرے اسلامی ملکوں کی تحریکوں میں کون سا واضح فرق ہے۔ اس کے تجزیہ کے مطابق مصر میں حکومت روایتی علماء کو مکمل طور پر اپنے کنٹرول میں رکھتی ہے اور انہیں اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرتی ہے۔ الازھر جو کہ اسلامی دنیا کی سب سے قدیم یونیورسٹی ہے وہ روایتی علماء کی تربیت کرتی ہے چونکہ یہ یونیورسٹی مکمل طور پر حکومت کی مالی امداد پر چلتی ہے اس لئے شیخ الازھر جو کہ حکومت کا نامزد ہوتا ہے اس سے حکومت بار بار یہ کہتی ہے کہ وہ اس کی حمایت میں فتوے جاری کرے۔ سادات نے جب اسرائیل کے ساتھ امن کا معاہدہ کیا تو اس وقت بھی شیخ الازھر سے کہا کہ وہ اس کے جائز ہونے کے بارے میں فتوی دے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ الازسر اور جامعہ ازھر کی وقعت نہ لوگوں کے دلوں میں رہی اور نہ انقلابی تحریکوں کے کارکنوں میں۔

الازھر کے علاوہ حکومت محکمہ اوقاف کے تحت تقریباً" دس ہزار مسجدوں کو اپنی نگرانی میں لئے ہوئے ہے اور یہاں پر امام مسجد اور مبلغ حکومت کی مرضی سے مقرر کئے جاتے ہیں اس کے علاوہ علماء کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے حکومت نے انہیں سہولت دے رکھی ہے کہ وہ ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعہ وعظ کرسکیں۔ جو مشہور مدرسے ہیں' انہیں حکومت مالی امداد دیتی ہے اور ان کی مطبوعات پر حکومت انہیں پیسہ فراہم کرتی ہے۔

اسی طرح سے مختلف طریقوں سے حکومت علماء کی ایک بڑی تعداد کو مالی طور پر امداد فراہم کرتی ہے اور اسی لئے جب حکومت کو ضرورت ہوتی ہے تو یہ علماء اس کی حمایت میں انقلابی تحریکوں کی مخالفت کرتے ہیں۔ روبن کے تجزیہ کے مطابق مصر میں چار قسم کے علماء ہیں۔

۱۔ روایتی علماء جو یہ سمجھتے ہیں کہ موجودہ نظام میں اس بات کی گنجائش ہے کہ اس کو تبدیل کیا جاسکے' یہ تبدیلی تبلیغ اور مذہبی تعلیمات کے ذریعہ ممکن ہے۔

۲۔ وہ بنیاد پرست نوجوان جن کا تعلق جمعیت اور دوسرے گروہوں سے ہے اور جو کہ تعلیمی اداروں میں سرگرم ہیں' وہ ان سرکاری علماء کی مخالفت کرتے ہیں۔

۳۔ اخوان المسلمون کے علماء جو اب سیاست میں حصہ لیتے ہیں وہ قانون سازی کے عمل سے شریعت کا نفاذ چاہتے ہیں۔

۴۔ انقلابی جماعتیں جو کہ مکمل طور سے تمام نظام کی مخالف ہیں اور تشدد کے ذریعہ اسلامی ریاست کو قائم کرنا چاہتی ہیں۔

مصر کی مختلف حکومتوں نے بنیاد پرستی کو روکنے اور حکومت کی مخالفت کو ختم کرنے کے جو اقدامات کئے ہیں ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ ان پر تشدد جماعتوں کے سربراہوں کو پھانسی دے دی جائے' دوسرا یہ کہ اخوان کو اپنے ساتھ ملا کر اور اس کے ساتھ سمجھوتہ کرکے اسے ایک روایتی سیاسی جماعت بنا دیا جائے۔ سادات اور مبارک دونوں نے جس پالیسی پر عمل کیا وہ یہ کہ علماء کو حکومت میں شامل کرکے انہیں مالی طور

پر محتاج بنا دیا جائے تاکہ وہ حکومت کی مخالفت نہ کرسکیں اور اس کے لئے استعمال ہوں۔

اس لئے حکومت یہ سمجھتی ہے کہ اس کے لئے ان چھوٹے انقلابی گروپوں کو ختم کرنا آسان ہے کیونکہ انہیں عوام کی حمایت حاصل نہیں ہے اور نہ ہی وہ ان میں بہت زیادہ مقبول ہیں۔ لیکن حکومت بنیاد پرستی کے جذبات کو اس قدر آسانی سے بھی ختم نہیں کرسکتی ہے کیونکہ وہ معاشی اور سیاسی حالات بدستور موجود ہیں کہ جو ان جماعتوں کو پیدا کرنے اور پرتشدد بنانے میں مددگار ہوئے ہیں۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ بنیاد پرستی کی ان تحریکوں نے مصر کی سیاست کو بدلنے میں اہم حصہ لیا ہے۔ روبن کے مطابق: مصر کی سیکولر اور بائیں بازو کی جماعتیں بنیاد پرستی کے عروج سے اس قدر خوف زدہ ہیں کہ انہوں نے خود ان کے نظریات کو اپنی جماعت کے منشور میں شامل کرنا شروع کردیا ہے' جس کی وجہ سے بنیاد پرستی اور زیادہ مضبوط ہوگئی ہے۔

اور یہ المیہ مصر ہی کا نہیں بلکہ دوسرے اسلامی ملکوں کا بھی ہے کہ جہاں سیاسی جماعتیں علماء کے دباؤ کے اندر اپنے منشور میں مذہبی دفعات کو شامل کر رہی ہیں تاکہ اس طرح سے لوگوں کی ہمدردیاں حاصل کرکے سیاسی اقتدار کو حاصل کرسکیں۔ اس لئے بعض اوقات یہ ترقی پسند جماعتیں بنیاد پرستی کو فروغ دینے میں زیادہ سرگرم ہوجاتی ہیں اس سے ان کی موقع پرستی صاف ظاہر ہوجاتی ہے کہ لوگوں کو تربیت دینے' پڑھانے اور سیاسی شعور دینے کی بجائے یہ بھی شارٹ کٹ اختیار کرکے جلد اقتدار پر قابض ہونا چاہتی ہیں۔

بنیاد پرستی اور جمہوریت

بنیاد پرستی جو کہ تشدد' جبر اور انتہاء پسندی کا نظریہ ہے وہ ایک ایسے معاشرہ میں مشکل سے پنپ سکتا ہے کہ جہاں ریاست نے تمام آزادی کو سلب کر رکھا ہو اور جہاں

سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں ہوں' اس لئے یہ خصوصیت سے اس معاشرہ میں کہ جہاں جمہوریت ہو اور عمل کی آزادی ہو وہاں خوب پھیلتی و پھولتی ہے لہٰذا ان تمام مسلمان ملکوں میں کہ جہاں بادشاہ یا امر حکومت کر رہے ہیں وہاں بنیاد پرستی کی تحریکوں کو سختی سے کچل دیا گیا ہے۔ سعودیہ عربیہ جیسے ملک میں کہ جو ایک اسلامی ریاست ہونے کا دعویٰ کرتا ہے جب ایک اسلامی انقلابی گروہ نے کعبہ پر قبضہ کرکے یہ مطالبہ کیا کہ ملک میں خالص اسلامی نظام کو نافذ کیا جائے تو ان کے خلاف فوری اقدامات کئے گئے اور انہیں سختی سے کچل کر رکھ دیا گیا اور یہی کچھ شام میں ہوا کہ جہاں حافظ الاسد نے بیس ہزار کے قریب لوگوں کو الحمص کے شہر میں قتل کروا دیا' عراق' لیبیا' اردن اور مراکش میں سیاسی طور پر اس قدر پابندیاں ہیں کہ وہاں حکومت کے خلاف ذرا سی بھی مخالفت کو برداشت نہیں کیا جاتا ہے۔

اس لئے بنیاد پرستی کی تحریک بھی انہیں ملکوں میں ابھر سکتی ہے کہ جہاں مخالفت کو برداشت کیا جاتا ہو۔ اس نظام میں انہیں بھی اس کی اجازت ہوتی ہے کہ وہ اپنی سیاسی جماعت بنائیں' اپنا لٹریچر تیار کریں اور اپنے مطالبات کے لئے تمام جمہوری اداروں اور روایات کو اختیار کریں۔ لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان ملکوں میں بنیاد پرست جماعتوں نے جارحانہ انداز میں سیاست پر اپنی اجارہ داری قائم کرنا شروع کردی ہے' وہ ان پڑھ اور جاہل عوام کے جذبات سے فائدہ اٹھا کر انہیں خوش آئند وعدوں کے ذریعہ اپنے ساتھ ملا رہے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ سیکولر جماعتیں جو اب تک سیاست پر حاوی تھیں' وہ آہستہ آہستہ پیچھے کی جانب ہٹ رہی ہیں۔

اس کی مثال مصر میں اخوان المسلمون کی ہے کہ جس نے اس بات کا اندازہ لگاتے ہوئے کہ ان کی پرتشدد پالیسی کی وجہ سے وہ مقبول عام سیاسی جماعت نہیں بن رہے ہیں اپنے پرانے موقف کو بدل دیا اور اس کی جگہ جمہوری اور اسلامی جماعت کی شکل اختیار کرلی ہے۔ عوام میں اپنے پرانے امیج کو تبدیل کرنے کی غرض سے انہوں نے جدید مصر کی تاریخ کو نئے نقطہ نظر سے پیش کرنا شروع کردیا ہے' اس میں اخوان کی جو

حیثیت ابھرتی ہے وہ یہ ہے کہ انہوں نے بادشاہت کے خلاف جدوجہد کی اور شاہ فاروق کے خلاف تحریک چلا کر اس کے جبر سے مصر کو آزاد کرایا۔

اب وہ ۱۹۵۲ء کے انقلاب میں بھی اپنا کردار بیان کرتے ہیں کہ جس کے نتیجہ میں جمال ناصر اقتدار میں آیا تھا۔ اس نئے نقطہ نظر سے اخوان نے خود کو سیاست کے دھارے میں شامل کرلیا ہے اور وہ حکومت و عوام دونوں کے لئے اس لئے قابل قبول ہے کہ وہ تشدد کی بجائے اصلاحات کے ذریعہ اسلامی نظام کا نفاذ چاہتے ہیں۔

وہ شخص کہ جس نے اس پالیسی کو عملہ جامہ پہنایا وہ التلمسانی (وفات ۱۹۸۶) تھا کہ جس نے اخوان کی پرتشدد پالیسی کو ترک کرکے دوسری سیاسی جماعتوں کے ساتھ معاہدے کئے۔ خاص طور سے اس کا وفد جماعت کے ساتھ تعاون قابل ذکر ہے۔ کیونکہ وفد ایک سیکولر جماعت کی حیثیت سے عوام میں روشناس تھی اور اس کے حمایتوں کی تعداد بھی عوام اور دانشوروں میں تھی' اس لئے اخوان کا وفد کے ساتھ جو اتحاد ہوا اس نے اسے مقبول بنانے اور اس کی سیاسی بنیادیں مستحکم کرنے میں مدد دی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام سیاسی جماعتوں نے عوام کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے اپنے اپنے منشور میں اسلام کو شامل کرلیا اور اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے ہر سیاسی جماعت سرگرم ہوگئی۔

اس صورت حال پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک تجزیہ نگار نے لکھا کہ : تمام سیاسی جماعتوں نے بغیر کسی تخصیص کے اپنے منشور میں اسلامی شریعت کے نفاذ کو اولیت دے دی ہے جب کہ اس سے پہلے یہ ہی سیاسی جماعتیں شریعت کے نفاذ کے نعرہ کو رجعت پسند اور قدامت پسند کہتی تھیں اور مذہب کے سیاسی استعمال کو برا سمجھتی تھیں۔

دیکھا جائے تو مصر کی طرح پاکستان بھی اسی عمل سے گذرا ہے۔ یہاں بھی اخوان کی طرح جماعت اسلامی نے اسلام کو بطور سیاسی حربہ کے استعمال کرکے پوری سیاست کو مذہبی رنگ دے دیا ہے۔ یہاں کے جمہوری اداروں اور روایات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے جماعت اسلامی نے مختلف سیاسی جماعتوں کے ساتھ انتخاب کے موقع پر اتحاد کئے

اور ان کو اس بات پر مجبور کیا کہ ان کا شریعت کے بارے میں جو نقطہ نظر ہے اسے منشور کا حصہ بنایا جائے اور اس کے نفاذ کی جائے۔ لہٰذا اس کی وجہ سے پاکستان کی سیاست کا پورا نقشہ بدل کر رہ گیا۔ لہٰذا اب تمام سیاسی جماعتیں جو سیکولر ہونے کا دعویٰ کرتی ہیں یا سوشل ازم کا' ان کا موقف بھی یہ ہوگیا ہے کہ وہ پاکستان میں حقیقی اسلامی نظام کو قائم کرکے اس کے تمام مسائل کو حل کریں گے۔

اس حقیقت کو بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ بنیاد پرست جماعتیں جمہوری اداروں اور روایات کے استعمال کے باوجود جمہوریت پر یقین نہیں رکھتی ہیں اس کی مثال الجزائر میں اسلامک سلویشن پارٹی کے موقف سے ظاہر ہے کہ جنہوں نے الیکشن میں کامیابی کے بعد یہ اعلان کردیا تھا کہ وہ اقتدار میں آنے کے بعد پھر کبھی الیکشن نہیں کرائیں گے اور نہ ملک میں جمہوری نظام کو باقی رکھیں گے۔ اس لئے بنیاد پرست جماعتیں جمہوریت میں اس وقت تک یقین رکھتی ہیں جب تک کہ وہ اس کو اپنے اقتدار کے لئے استعمال کرسکیں اور اس نظام میں اپنے نظریات کو پھیلا سکیں' لیکن جیسے ہی وہ اقتدار میں آجائیں' وہ سب سے پہلے جمہوریت سے چھٹکارہ پائیں گے' کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ جمہوری نظام میں وہ سختی و جبر سے اپنے نظریات کا نہ تو نفاذ کرسکتے ہیں اور نہ لوگوں کا ذہن بدل سکتے ہیں۔

اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا جمہوری نظام میں ایسی جماعتوں کو کام کرنے کی اجازت ہونی چاہیے کہ جو غیر جمہوری ذہن کی ہیں اور جن کے منشور میں یہ ہے کہ وہ کامیاب ہوکر اس نظام کو ختم کردیں گی اور اس کی جگہ انتہاء پسندی کے نظریہ کو قائم کریں گی؟

○

مسلمان معاشروں کا مطالعہ

ہمارے ہاں اکثر یہ خیال کیاجاتا ہے کہ یورپ کے مستشرقین اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں اور ان کی تحقیق کا مقصد یہ ہے کہ اسلام کو نقصان پہنچایا جائے۔ اگرچہ اس میں تھوڑی بہت صداقت ضرور ہے مگر یہ بات تمام مستشرقین کے لئے نہیں کہی جاسکتی ہے۔

یورپ میں جب کہ وہاں اسلام کا مطالعہ یونیورسٹیوں میں شروع ہوا تو اسی وقت اسلام پر ان لوگوں نے کام کرنا شروع کیا کہ جو مشنری تھے' لہٰذا ان کا مقصد یہ تھا کہ اسلام کی کمزوریوں کو اجاگر کیا جائے۔ جو ان کے لئے تبلیغی مشن کے لئے فائدہ مند تھا' یورپی نو آبادیاتی نظام اور یورپ کے تجارتی اور سیاسی مقاصد نے بھی مشرق کے مطالعہ کو اپنے حق میں استعمال کیا اور اسی سلسلہ میں یورپ کے مستشرقین کی تحقیق جو اسلام کے بارے میں ہے وہ بھی متاثر ہوئی۔

لیکن آہستہ آہستہ جیسے جیسے نو آبادیاتی نظام کمزور ہوتا چلا گیا' اسی طرح سے اسلام کے مطالعہ کے جو اسکالرز تحقیق کے میدان میں آئے ان کا نقطہ نظر بھی بدلتا چلا گیا اور اسی دوران یورپ اور امریکہ کی جامعات سے محقیق کی نسل تیار ہوئی کہ جنھوں نے سیاست سے بالاتر ہوکر آزادانہ اور سچائی کے ساتھ اسلام کا مطالعہ کیا۔

ابتدائی دور میں چونکہ مشرقی علوم کے مطالعہ کا تعلق سیاست سے تھا' اس لئے مستشرقین نے سیاسی تاریخ پر تحقیق کی' لیکن اب وقت کے ساتھ ساتھ تحقیق کا رخ سیاست سے ثقافت اور سماجی پہلوؤں کی طرف مڑ گیا ہے اس لئے نئی تحقیق میں ان

موضوعات پر لکھا جارہا ہے کہ جو مسلمان معاشرہ اور ان کے رویوں اور رجحانات کو سمجھنے میں مدد دیں۔

خاص طور سے موجودہ زمانہ میں کہ جب علم کی حدود بڑھ گئی ہیں کسی ایک محقق کے لئے یہ ممکن نہیں رہا ہے کہ وہ معاشرے کے ہر پہلو پر گہرائی اور جامعیت کے ساتھ لکھے اسی لئے جب بھی ایک جامع تاریخ لکھوانا ہوتی ہے تو مختلف شعبوں کے ماہرین سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے موضوعات پر لکھیں مگر اس قسم کی جامع تاریخ کی کمزوری یہ ہوتی ہے کہ اس میں کوئی ایک نقطہ نظر نہیں ہوتا ہے ہر ماہر اپنے نقطہ نظر سے موضوع کو دیکھتا ہے اور اس لئے بعض اوقات موضوع الجھ کر رہ جاتا ہے پھر اس میں واقعات کا اعادہ بار بار ہوتا ہے۔

اس لئے اس بار پروفیسر اراء لاپی ڈس نے یہ تجربہ کیا کہ مسلمان معاشروں کی ایک جامع تاریخ خود لکھی۔ اس کی ابتداء اسلام کے شروع ہونے سے ہوتی ہے اور اسے ۱۹۸۳ء تک لایا گیا ہے اس میں مصنف نے سیاسی' سماجی اور ثقافتی پہلوؤں پر محققانہ انداز میں لکھا ہے اور اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ ہر مسلمان معاشرہ ثقافتی طور پر ایک دوسرے سے جدا ہے ان میں مذہب اتحاد کا ایک عنصر ضرور ہے مگر ان کے ثقافتی عناصر بالکل علیحدہ ہیں۔ اس لئے ہر مسلمان معاشرہ میں اسلام کا ایک جداگانہ تصور ہے۔

اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ اس میں اب تک اسلام پر کی گئی تحقیقات کے نتائج کو شامل کیا گیا ہے اور اس لئے مصنف نے ثانوی ماخذ پر بھروسہ کرتے ہوئے ان کی روشنی میں اسلامی معاشروں کا مختلف ملکوں میں جو ارتقاء ہے اسے بیان کیا ہے۔

اس نے ان بہت سارے اعتراضات کا بھی جواب دیا ہے کہ جو اب تک اسلام پر کئے جاتے تھے' یہ اعتراضات دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک تو وہ کہ جن میں تعصب کی وجہ سے اسلام کو برا بھلا کہا گیا ہے اور دوسرے وہ کہ جو بنیادی ماخذوں کو غلط پڑھنے اور ان کے معنی نہ سمجھنے کی وجہ سے ہوئے۔ مثلاً" اب تک مغرب میں یہ سمجھا جاتا

تھا کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا۔ اور مسلمانوں کی جو تصویر ابھرتی تھی وہ یہ کہ ان کے ایک ہاتھ میں تلوار تھی اور دوسرے میں قرآن' اور وہ لوگوں کو جبر و تشدد سے مسلمان کررہے تھے اب خود مغربی محققین نے جدید تحقیق کی روشنی میں اس کو رد کردیا ہے اور یہ ثابت کردیا ہے کہ اسلام کے پھیلنے میں پر امن ذرائع زیادہ اہم تھے۔ مسلمان حکمران درحقیقت حکومت کرنا چاہتے تھے اور ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ لوگ مسلمان ہوں یہی وجہ ہے کہ عباسیوں کے دور حکومت میں مشرق وسطی کے ممالک جو ان کی امپائر میں تھے' وہاں مسلمانوں کی اکثریت نہیں تھی۔ مسلمانوں کے حکمران طبقے شہروں میں رہتے تھے اور دیہاتوں میں لوگ اپنے آبائی مذاہب پر عمل کرتے تھے۔

لوگوں کے مسلمان ہونے کا عمل اس وقت شروع ہوا کہ جب عباسی خلافت کو زوال ہوا۔ اور نئے حالات میں لوگوں پر جو سیاسی' معاشی اور سماجی دباؤ آئے ان کی وجہ سے وہ مسلمان ہونا شروع ہوئے اور یہ سارا عمل ۱۳ ویں صدی میں جاکر پورا ہوا کہ پورے مشرق وسطی میں مسلمان اکثریت میں ہوگئے۔

مصنف نے تبدیلی مذہب کے سلسلہ میں دو رجحانات کی نشاندہی کی ہے: جب عربوں اور ایرانیوں اور ترکوں نے مختلف غیر مسلمان ملکوں کو فتح کیا تو انہوں نے لوگوں کو مسلمان کئے بغیر وہاں اپنے سیاسی اقتدار کو قائم کیا۔ دوسرے سلسلہ میں یہ ہوا کہ مفتوحہ ملک کا طبقہ اعلیٰ مسلمان ہوگیا اور انہوں نے اپنے معاشرے کے ثقافتی ورثہ کو اسلام میں منتقل کردیا۔ اس لئے اسلام کا ان ملکوں میں ثقافتی ڈھانچہ بدل گیا جیسے انڈونیشیا' ہندوستان اور افریقہ کے بہت سے ممالک۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی کلچر کوئی وحدت نہیں رہا بلکہ ہر ملک میں یہ بدلتا رہا' اور اس میں مقامی کلچر کے عناصر عرب کلچر پر حاوی ہوگئے۔ لیکن ان ملکوں میں کہ جہاں مسلمان حکمران طبقے اقلیت میں رہے' وہاں وہ انتہاء پسند اور جارحانہ انداز کے حامل رہے اور وہاں کے مقامی کلچر کو اختیار کرنے میں سخت مزاحمت کی۔ اس لئے مقامی کلچر انہیں معاشروں میں اسلامی کلچر کا حصہ

بنا کہ جہاں مفتوح اور فاتح مل گئے ان معاشروں میں مذہبی رواداری اور روشن خیالی پیدا ہو گئی۔

کتاب کے دوسرے حصہ میں مصنف نے خود مختار مسلمان ریاستوں پر بحث کی ہے اور یہ کہ ان کے ڈھانچہ میں کس طرح سے علماء اور صوفیوں کو شامل کیا گیا۔ اس سلسلہ میں ایران میں جب صفویوں نے اپنی خود مختار حکومت قائم کی تو انہوں نے اپنے سیاسی مقاصد کے لئے مذہب کو مکمل طور پر استعمال کیا اور وہاں کی سنی اکثریت کو زبردست شیعہ بنایا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بادشاہ کی ذات میں سیاسی و مذہبی دونوں طاقتیں مل گئیں اور انہوں نے مطلق العنانیت کے ساتھ حکومت کی۔ یہ مثال جدید ایران پر بھی صادق آتی ہے کہ جہاں ایک بار پھر سیاست و مذہب نے مل کر آمرانہ رجحانات کو پیدا کردیا ہے۔

کتاب کے آخری حصہ میں مصنف نے مسلمان ملکوں کا یورپ کے ماتحت ہونا اور اس کے اثرات پر بحث کی ہے۔ نو آبادیات میں تبدیل ہونے کے بعد وہاں دو قسم کے رجحانات پیدا ہوئے : ایک علماء کا رویہ تھا کہ جنہوں نے فوراً" غیر ملکی طاقتوں کے خلاف جہاد کا اعلان کردیا اور احیاء کی تحریکوں کے ذریعہ خالص اسلام کے نفاذ کی جدوجہد شروع کی۔

دوسرا رجحان جدید تعلیم یافتہ طبقہ کا تھا' ان کی پالیسی تھی کہ اسلام کو جدید خطوط پر استوار کیا جائے تاکہ یورپی تسلط کا مقابلہ کیا جاسکے۔

اور یہ صورت حال اب تک تمام مسلمان ملکوں میں ہے کہ جدید زمانے کے تقاضوں سے کیسے نپٹا جائے' احیا کے ذریعہ یا جدید نظریات کو اختیار کرکے۔

○

قومی ریاست کا عروج و زوال

تاریخ میں کوئی چیز مستقل نہیں ہے' قومیں' ریاستیں' حکمران' حکومتیں' خاندان اور تہذیبیں عروج و زوال کے عمل سے گذرتی رہتی ہیں۔ کچھ مورخ اور فلسفی اس عمل کو سمجھنے کی خاطر اس کے پس منظر میں جو وجوہات ہیں انہیں دریافت کرنے اور اس کے قوانین کو پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان مشہور فلسفیوں نے جنھوں نے عروج و زوال کے قوانین دریافت کرنے کی کوشش کی ان میں ابن خلدون' ویکو' اسپنیگلر اور ٹائن بی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

اسپنیگلر نے مغرب کے زوال کی پیش گوئی کردی تھی اور اب مغربی مورخین یورپ کی قومی ریاستوں کے عروج و زوال کا تجزیہ کر رہے ہیں اور انہیں اس کی بھی پریشانی ہے کہ کیا امریکہ بھی اسی راستہ سے گذر کر زوال پذیر ہوجائے گا۔ اس صورت کا تجزیہ ۱۹۹۱ء میں شائع ہونے والی کتاب "قومی ریاست کا عروج و زوال" میں کیا گیا ہے جسے مائیکل من نے ایڈٹ کیا ہے۔

آکسفورڈ یونیورسٹی کا مورخ پیٹرک رو برائن نے برطانوی امپائر اور اس کی نو آبادیات کے قیام اور ان کی آزادی کا تجزیہ کرتے ہوئے اس طرف نشان دہی کی ہے کہ برطانوی امپائر کے زوال کی وجہ اس کا پھیلاؤ تھا' جس کی وجہ سے مزدور طبقہ پہلے سے زیادہ غریب ہوگیا۔ سلطنت کا یہ پھیلاؤ معاشی طور پر آگے چل کر اس کے لئے غیر منافع بخش ثابت ہوا۔ اس طرح سیاسی طور پر یہ نو آبادیات بحران کے وقت انگلستان کی مدد نہیں کرسکیں۔ مثلاً" جب ۱۹۴۱ء میں جرمن نے انگلستان پر حملہ کی دھمکی دی تو

انگلستان کو اپنا بحری بیڑہ واپس بلانا پڑا۔ تاکہ جرمنی سے اپنا تحفظ کرسکے، کیونکہ اس وقت نو آبادیات اس قسم کی مدد نہیں کرسکتی تھیں اس نے مزید اس عمل کی جانب بھی نشان دہی کی ہے کہ امپریل ازم کے نتیجہ میں اس کے خلاف مزاحمتی تحریکیں شروع ہوئیں جس نے امپریل طاقت کے ذرائع ان کے خاتمہ میں صرف کرکے انہیں معاشی طور پر دیوالیہ کردیا اور یہیں سے ان کے خاتمہ کی ابتداء ہوگئی ہے جس نے بالاخر نو آبادیات کو آزاد کردیا۔

وولف گانگ مومزن نے اپنے مقالہ "جدید تاریخ میں قومی ریاست کی اقسام" پر بحث کرتے ہوئے یورپ میں قومی ریاست کی پیدائش کی تاریخ بیان کی ہے اور یہ کہ کس طرح سے انیسویں صدی میں یہ تصور ابھرا کہ صرف قومی ریاست میں روشن خیالی اور لبرل ازم پروان چڑھ سکتے ہیں اور اس میں رواداری نہ سیاست جڑ پکڑ سکتی ہے۔ اطالوی قوم پرست مازنی کا خیال تھا کہ بڑی سلطنتیں اور چھوٹی ریاستیں ہمیشہ ایک دوسرے سے جنگ میں مصروف رہتی ہیں لہٰذا ان جنگوں سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ قومی ریاست کو قائم کیا جائے کہ جس میں رہنے والی قومیں اور نسلی گروہ ساتھ رہنے پر رضامند ہوں اور پھر وہاں ایک لبرل دستور کے ذریعہ انتظام کو چلایا جائے۔

لیکن ہوا یہ کہ جب قومی ریاستیں وجود میں آنا شروع ہوئیں تو انہوں نے مازنی کے آئیڈیل کی نفی کرتے ہوئے اپنی طاقت کو پھیلانے کے لئے ایک دوسرے کے خلاف جارحانہ انداز کو اختیار کرکے لڑائی و خون ریزی کی ابتداء کردی۔

ان قومی ریاستوں کے پس منظر میں متحرک قوت چنیدہ سیاسی گروہ تھے کہ جنہوں نے قومی ریاست کو مضبوط اور طاقت ور بنانے کے لئے جنگ کی راہ اختیار کی اور اپنے ہم وطنوں کے جذبات کو بھڑکا کر انہیں اپنے ساتھ ملا لیا تاکہ ان کی مدد سے وہ اپنے منصوبہ کو پورا کرسکیں۔ اس لئے بورژوا طبقوں نے ریاست پر اپنا تسلط جما کر لوگوں کو اپنے مقصد کے لئے استعمال کیا۔

مومزن نے جرمنی کی قومی ریاست اور اس کی تشکیل کے بارے میں نشان دہی کی

کہ اگرچہ جرمن بورژوا نے اس بات کی کوشش کی کہ جرمنی کو آسٹریا اور پروشیا کے چنگل سے آزاد کرایا جائے۔ مگر اس کا اتحاد چونکہ نیچے نہیں بلکہ اوپر سے آیا تھا اس لئے اس کے ڈھانچہ میں پروشیا کی مطلق العنانیت باقی رہی۔ وسطی یورپ میں جو قومی تحریکیں ابھریں وہ نہ صرف اپنی پرانی سلطنتوں کے خلاف تھیں جن میں روس' آسٹریا' ہنگری اور عثمانی سلطنتیں تھیں بلکہ وہ اپنے ہمسایوں کے منصوبوں اور ان کے توسیع پسند دعووں کی بھی مخالف تھیں۔

اس لئے قومی ریاست کے ضمیر میں جہاں ڈر اور خوف شامل تھا' وہاں جارحانہ عزائم بھی پوشیدہ تھے اور اس لئے انہوں نے پرتشدد پالیسی کو اختیار کیا۔ ایک اقلیتی گروہ نے حکومت اور اس کے اداروں پر قبضہ کرکے عوام کو اپنے قابو میں کرلیا اور جو چھوٹے چھوٹے نسلی و ثقافتی گروہ تھے انہیں ملکی اتحاد اور یگانگت کے نام پر ختم کرنے کی کوششیں کیں۔ چنانچہ اس نام نہاد وطن پرستی کے نام پر انہوں نے علاقائی اور صوبائی ثقافتی سرگرمیوں کو کچل کر رکھ دیا۔

مومزن نے ایشیا و افریقہ میں نو آبادیات کے قیام کی ذمہ داری بھی قومی ریاستوں کے قیام پر ڈالی ہے کہ جنہوں نے ایک دوسرے کی رقابت میں زیادہ سے زیادہ نو آبادیات پر قبضے شروع کردیئے۔ کیونکہ باہمی مقابلہ کی وجہ سے یہ ہوگیا تھا کہ جس کے پاس زیادہ نو آبادیات ہوں گی اس کا رتبہ دوسرے کے مقابلے میں زیادہ اونچا ہوگا' لہذا امپریل ازم کو قومی ریاست کی وجہ سے نئی توانائی مل گئی اور انہوں نے ایشیا و افریقہ کے لوگوں کو مہذب بنانے کے عمل میں انتہاء پسندی کو اختیار کرتے ہوئے جابرانہ ذرائع کو اختیار کیا۔ اس نے بدترین قسم کی وطن پرستی کو بھی مقبول عام بنایا اور پہلی جنگ عظیم ان جذبات کی پیدوار تھی کہ جس میں جنگ کو مثبت انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ اس کی وجہ سے لوگوں میں قومی فخر و مباہات کے جذبات خوب ابھرے اور وہ اپنے ملک کے مفادات کے تحفظ کے لئے متحد ہوگئے لیکن پہلی اور دوسری عظیم جنگوں نے یورپ میں بالاخر قومی ریاست کے غلبہ کو ختم کردیا۔

لیکن جب نو آبادیاتی نظام ختم ہوا تو اس کے نتیجہ میں نئے آزاد ملکوں میں قومی ریاستوں کی تشکیل ہوئی اگرچہ یہ ریاستیں امپریل ازم کے خلاف تھیں اور اپنی ثقافت اور زبان کے تحفظ و ترقی کے لئے زور دے رہی تھیں' لیکن ان ریاستوں کی تشکیل میں بھی ایک طرف تو اقلیتی حکمران طبقے تھے اور دوسری طرف ان کے ہاں بھی ہمسایوں کے خلاف جارحانہ عزائم تھے۔

اور یہی صورت پاکستان میں ہے کہ اس نئی ریاست میں جاگیردار اور طبقہ اعلیٰ کے لوگ اقتدار پر قابض ہیں اور یہ لوگ قومی یگانگت کے نام پر نسلی اور علاقائی شناختوں کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔ معاشرہ میں قومی جذبات کو زندہ رکھنے کی خاطر انہوں نے ہمسایوں کے خلاف جارحانہ پالیسی اختیار کر رکھی ہے۔ اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ صورت حال زیادہ دیر تک برقرار رہ سکے گی؟ اس لئے ہمیشہ یورپ کی قومی ریاستوں کے عروج و زوال سے سبق سیکھنا چاہئے۔

تاریخ اور تحقیق کے مسائل

تاریخ کی تحقیق میں بہت سارے مسائل ہیں جن سے ایک محقق کو پاکستان میں دوچار ہونا پڑتا ہے ان میں کچھ تو یہ ہیں : بنیادی ماخذوں کی کم یابی' دستاویزات کے بارے میں کم علمی اور ان کی ناممکن دستیابی' جدید شائع شدہ کتابوں اور علمی رسالوں کا نہ ملنا وغیرہ لیکن ان مسائل پر بھی محقق کسی نہ کسی طرح قابو پالیتا ہے اور تحقیقی مواد کو تھوڑا بہت کہیں نہ کہیں سے حاصل کرلیا جاتا ہے' اگرچہ اس میں جو محنت اسے کرنی پڑتی ہے وہ بعض اوقات تحقیقی کام کو لکھنے سے زیادہ ہوجاتی ہے۔

لیکن دیکھا جائے تو جو سب سے بڑا مسئلہ تحقیق کی راہ میں آتا ہے وہ حکومت اور معاشرے کی جانب سے واضح اور صاف اور چھپا ہوا اور پوشیدہ سنسرشپ ہے جو ایک مورخ کو اس بات پر مجبور کرتا ہے کہ وہ کوئی ایسی تحقیق نہ کرے جو کہ حکومت اور معاشرے کی روایات کے خلاف ہو۔ اس سلسلہ میں بھی وہ مورخ کہ جو قدیم یا قرون وسطی کی تاریخ پر کام کرتے ہیں ' اس سنسرشپ سے اس طرح سے بچ سکتے ہیں کہ وہ اسے موضوعات کو منتخب کریں کہ جو زیادہ جذباتی نہ ہوں۔ مگر اس کے باوجود مسئلہ اپنی جگہ پر برقرار رہتا ہے' کیا مورخ صرف ایسے موضوعات پر لکھے کہ جو حکومت اور معاشرے کو خوش کریں یا ایسے موضوعات پر کہ جو معاشرے کو تبدیل کریں اور اپنی سوچ کو بدلیں؟ کیا ایک مورخ کے لئے ضروری ہے کہ قائم شدہ نظریات کو دہرائے اور محض ان کی تقلید کرے یا وہ ان کو چیلنج کرے اور ان کی جگہ انقلابی خیالات کو فروغ دے؟ ظاہر ہے کہ تاریخ صرف اسی صورت میں مفید ہوسکتی ہے کہ جب اس کے

ذریعہ ذہن کو بدلنے کا کام کیا جائے وہ تاریخی تحقیق کہ جو قائم شدہ قدروں کو مستحکم کرے یہ بہت جلد اپنی توانائی اور دلکشی کھو دیتی ہے۔

مگر مسئلہ ان مورخوں کے لئے آتا ہے کہ جو جدید تاریخ پر تحقیق کرنا چاہتے ہیں' اور خاص طور سے تاریخ جدوجہد آزادی اور ملک کی تقسیم پر' کیونکہ سرکاری مورخوں نے جدید تاریخ کی تشکیل کرتے ہوئے واقعات کی ایک زنجیر بنا دی ہے جو اس بات کو ثابت کرتے ہیں کہ دو قومی نظریہ منطقی تھا اور اس کے نتیجہ میں ملک کی تقسیم کے علاوہ اور کوئی حل نہیں تھا۔ اس سرکاری نقطہ نظر کو پروپیگنڈے اور نصابی کتابوں کے ذریعے لوگوں کے ذہن میں اس قدر راسخ کردیا ہے کہ وہ اس کے علاوہ کسی اور نقطہ نظر کو سننے یا سمجھنے پر تیار نہیں ہیں۔ لہٰذا اگر اس کے خلاف کچھ لکھا جائے تو اسے غداری کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔

لیکن تاریخ کو زیادہ دیر تک ایک سانچہ میں قید کرکے نہیں رکھا جاسکتا ہے' نئی کتابیں نئی دستاویزات اور نئے خیالات واقعات کی تشریح کو بدلتے رہتے ہیں جدید تاریخ پر کام پاکستان کے علاوہ غیر ملکی یونیورسٹیوں میں بھی ہو رہا ہے اور اس نئی تحقیق کے نتائج ہمارے ہاں بھی آجاتے ہیں اور ذہنوں کو متاثر کرتے ہیں۔

لہٰذا اس قسم کی تحقیق کو روکنے اور نئے نقطہ نظر پر پابندی عائد کرنے کی غرض سے حکومت نے ۱۷ فروری ۱۹۹۱ء میں ایک بل پاس کیا جو ۱۲۳ (۸) کے تحت ہے اور جس کا عنوان ہے "ریاست کی تخلیق کی مذمت کرنا' اور اس کے اقتدار اعلیٰ کو ختم کرنا" اس میں کہا گیا ہے کہ:

"کوئی بھی پاکستان یا پاکستان سے باہر لوگوں پر اثر انداز ہونے کی نیت سے یا یہ جانتے ہوئے کہ اس سے لوگ اثر انداز ہوں گے اگر یہ کام کوئی فرد' یا کوئی گروہ کرے کہ جس سے نظریہ پاکستان کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو یا اقتدار اعلیٰ اس سے متاثر ہو تو چاہے اس کی یہ کوششیں تحریری ہوں یا لفظی یا عملاً اور اس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ پاکستان کو برا کہتا ہے یا اس کی تخلیق کو

قابل مذمت سمجھتا ہے اور تقسیم ہند کو غلط تصور ہے کہ جو ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء میں عمل میں آئی تھی' اور اس کی سرحدوں کے بارے میں تنقید کرتا ہے تو ایسے شخص کو دس سال کی قید بامشقت دی جانی چاہیے اور اس کے علاوہ اس پر جرمانہ بھی ہوسکتا ہے۔

اس قانون کے بننے کے بعد وہ مورخ جو اس موضوع پر تحقیق کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے صرف ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ وہ سرکاری نقطہ نظر کی حمایت کریں اور ہر اس نتیجہ کو جو اس کے خلاف ہو اسے نظرانداز کردیں۔ مگر اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟ کیا اس سے ہماری تاریخ ایک جگہ ٹھہر کر نہیں رہ جائے گی' کیا اس میں نشوونما پانے کی صلاحیت ختم نہیں ہوجائے گی؟ اور کیا اس کے نتیجہ میں ہمارے معاشرے کا ذہن ٹھٹھر کر نہیں رہ جائے گا؟ اور جب یہ سب کچھ ہوگا تو اس کا فائدہ کس کو ہوگا؟ حکمران طبقوں کو جو چاہتے ہیں کہ حالات کو اسی طرح سے رہنے دیا جائے اور انہیں چیلنج نہیں کیا جائے' کیونکہ اسی نظام میں ان کے مفادات کا تحفظ ہے اور اس لئے یہ قانون پاس ہوا تاکہ بحث و مباحثہ' تنقید اور مخالفت کو ختم کردیا جائے۔

حکومت کے اس قانون کے ساتھ ساتھ سیاسی و مذہبی جماعتوں کا اپنا دباؤ ہے جو دن بدن ہمارے دانشوروں پر بڑھ رہا ہے لہٰذا ان حالات میں ایک محقق کے لئے آزادانہ تحقیق کے تمام راستے بند ہوگئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اب تک ہمارے ہاں کوئی ایسا محقق نہیں پیدا ہوا کہ جس نے تحقیق کی فیلڈ میں کوئی ایسا کارنامہ سرانجام دیا ہو کہ جس سے غیر ملکی اسکالرز بھی متاثر ہوئے ہوں۔ اس سے زیادہ شرم کی بات اور کیا ہوگی کہ بانی پاکستان پر کوئی جامع سوانح حیات پاکستانی اسکالرز کی بجائے ایک غیر ملکی نے لکھی اور یہ اس لئے کہ جو کچھ اس غیر ملکی اسکالر نے لکھا ہے وہ کوئی پاکستانی لکھنے کی جرات نہیں کرسکتا تھا۔

اور صرف یہی مسائل نہیں اس کے علاوہ ہمارے مذہبی' سیاسی اور سماجی تعصبات ہیں کہ جو ہمیں حقائق کو ظاہر کرنے کی بجائے انہیں چھپانے پر مجبور کرتے ہیں' مثلاً

ہمارے ہاں جو احمدیوں کے خلاف جذبات ہیں ان کو دیکھتے ہوئے کون جرات کر سکتا ہے کہ وہ ظفر اللہ خان کی تعریف کرے اور یہی صورت مذہبی اقلیتوں کی ہے کہ جن کا سیاسی کردار تاریخ میں کم سے کم کر کے دکھایا جاتا ہے تاکہ انہیں سیاسی حقوق سے محروم رکھا جائے اور یہ دلیل دی جائے کہ انہوں نے تحریک پاکستان میں کوئی حصہ نہیں لیا۔

ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ برطانوی دور کی بہت دستاویزات خصوصیت سے سی آئی ڈی کی رپورٹس مورخوں کی پہنچ سے دور ہیں کیونکہ انہیں اب تک خفیہ رکھا جاتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان رپورٹس میں ہمارے سیاستدانوں اور جاگیرداروں کے بارے میں مخبری کرنے کا مواد ہے' جو انہوں نے حکومت برطانیہ کے لئے کی تھی' اگر ان رپورٹس کو شائع کردیا جائے تو ہمارے بہت سے آزادی کے کارکن حکومتی مخبروں کی حیثیت سے لوگوں کے سامنے آئیں گے۔ اس لئے ہمارے حکمران طبقوں کی یہ شعوری کوشش ہے کہ تاریخ کو ظاہر کرنے کی بجائے اسے چھپایا جائے اور صرف اسی تاریخ کو بیان کیا جائے کہ جو ان کے حق میں ہو۔

لہٰذا ہمارے معاشرے میں تاریخ کس مپرسی کے عالم میں ہے اور ہمارے مورخوں کے لئے دو ہی راستے ہیں یا تو وہ حکومت کے ملازم بن کر ان کی خوشنودی کے لئے تاریخی حقائق کو مسخ کریں یا ایسے موضوعات کو منتخب کریں کہ جس میں حکمران طبقوں کو کوئی دلچسپی نہ ہو نتیجہ یہ ہے کہ تاریخ بحیثیت مضمون کے اپنی افادیت کھو چکی ہے اور ہماری آگہی کے لئے ایک ہی راستہ رہ گیا ہے اور وہ ہے غیر ملکی اسکالرز کی تحقیق کا لیکن اس کے جو نقصانات ہوں گے اس سے شاید ہمارا معاشرہ واقف نہیں ہے کہ آہستہ آہستہ ہمارا نظریاتی ڈھانچہ جب خستہ ہو کر گرے گا تو اس کی جگہ لینے والا کوئی متبادل نظریہ ہمارے پاس نہیں ہوگا۔

○

آلو اور اس کے سماجی اثرات

انسانی معاشروں میں جس طرح نئی ایجادات تبدیلیاں لے کر آتی ہیں اور معاشرے کی سماجی' اقتصادی اور سیاسی زندگی کو بدل دیتی ہیں۔ اس طرح سے غذا نے بھی انسانی معاشرہ کو تبدیل کرنے اور انسانی عادات و اطوار کو بدلنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اپنی پوری تاریخ میں انسان نے آہستہ آہستہ مختلف اقسام کے اناج ' سبزیوں اور جڑی بوٹیوں کے بارے میں دریافتیں کیں اور انہیں اپنی غذا کے لئے استعمال کیا۔ انسان کا مسئلہ ان چیزوں سے پیٹ بھرنا ہی نہیں ہوتا بلکہ یہ بھی کہ اسے کس طرح سے پر ذائقہ بنایا جائے۔ اس لئے ایک ہی سبزی کو پکانے کے کئی طریقے دریافت ہوئے اور مسالوں کی دریافت نے کھانے کی تیاری میں اور انہیں پر ذائقہ بنانے میں بڑی مدد کی۔

دراصل جیسے جیسے انسانی آبادی بڑھتی رہی اسی طرح سے انسان کی غذائی ضروریات بھی بڑھتی رہیں اور اس نے فطرت کے ذخائر سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسی اشیاء کو دریافت کیا کہ جو اس کی غذائی ضروریات کو پورا کریں' ابتداء میں جو قبائل اور قومیں جن علاقوں میں رہتے تھے انہوں نے وہاں کی اشیاء کے بارے میں تحقیقات کیں لیکن جب ان کا باہمی رابطہ ہوا تو اس سے ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھایا گیا اور اس بات کی کوشش کی گئی کہ ایک دوسرے کے علاقوں کے درخت' پودے اور اناج اور سبزیاں لگائی جائیں اور ان سے فائدہ اٹھایا جائے ' یہی وہ بنیادی ضرورت تھی کہ جس نے علم نباتات کی بنیاد ڈالی' اور اس کا مطالعہ کیا گیا کہ کون سے درخت یا سبزیاں کہاں کاشت ہوسکتی ہیں۔ آپس کے رابطوں کی وجہ سے مختلف معاشروں میں غذائیں بھی

بدلتی رہیں اور اس کے ساتھ ہی لوگوں کے سماجی رشتے اور عادات بھی۔

پرانی دنیا کے غذائی ذخیرے میں اس وقت زبردست اضافہ ہوا جب کہ اہل یورپ نے نئی دنیا کو دریافت کیا اور وہاں سے آلو اور مکئی جیسی غذائی اشیاء کو پرانی دنیا سے روشناس کرایا۔ اس کے یورپ پر اور دنیا پر کیا اثرات ہوئے' خصوصیت سے آلوؤں کی دریافت سے' اس موضوع پر ریڈ کلف سولومن نے ایک کتاب لکھی جس کا موضوع ہے آلوؤں کی تاریخ اور اس کے سماجی اثرات" یہ کیمرج یونیورسٹی پریس سے پہلی مرتبہ ۱۹۴۹ء میں چھپی تھی' اس کے بعد اس کے چھ ایڈیشن چھپے ہیں ' اس میں مصنف نے تفصیل سے آلوؤں کی دریافت اس کی مختلف اقسام اور یورپ میں اس کی آمد اور اس کے استعمال کو بیان کیا ہے۔ بنیادی طور پر مصنف ماہر علم بناتات ہے' مگر اس نے آلوؤں کے ساتھ ساتھ جن جن ملکوں میں یہ گئے ان کی تاریخ کو بھی بیان کیا ہے خصوصیت سے آئرلینڈ کی تاریخ کو کہ جہاں آلوؤں کا استعمال خاص اہمیت رکھتا ہے۔

سولومن کی تحقیق کے مطابق آلوؤں کی کاشت جنوبی امریکہ میں پیرو اور بولیوا کے علاقوں میں ہوئی تھی کہ جہاں انکا تہذیب کا عروج ہوا تھا۔ آلوؤں کی غذائی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس کی کاشت سے پہلے انسان کی قربانی کی جاتی تھی تاکہ فصل زرخیز ہو بعد میں انسان کی جگہ جنوبی امریکہ کا جانور لامہ قربان کیا جانے لگا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس علاقہ میں غذا کا بڑا انحصار آلوؤں کی کاشت پر ہوتا تھا یورپ میں سب سے پہلے آلوؤں کو کولمبس نے روشناس کیا یہ ۱۴۹۳ میں میٹھے آلو ہیٹی سے اسپین لایا اور وہاں بعد میں اس کی کاشت کی گئی شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جلد ہی مقبول ہوگئے کیونکہ امریکہ جانے والے جہازوں میں آلوؤں کی بڑی مقدار ہوتی تھی۔

جنوبی امریکہ کے علاقے میں اسے پاپو کہتے تھے جس کے معنی جڑوں کے ہیں اسے پاپا بھی کہا جاتا تھا جو پیرو کے زبان کا لفظ تھا' دوسرے جنوبی امریکی ملکوں میں اس کے مختلف نام تھے' مثلاً" چلی میں اسے پوگنی یا پولی کہتے تھے لیکن پاپو' اور پاپا سے بٹاٹا اور پٹاٹا بنا اور آخر میں انگریزی میں پوٹاٹو ہوگیا۔ پرتگالوں کے زمانہ گوا میں اسے بٹاٹا سورتا

کہتے تھے کیونکہ یہاں یہ سورت کے راستے سے آیا تھا' بعد میں اسے ارتھ اپل (Earth Apple) بھی کہا گیا جس کا ترجمہ ایرانیوں نے سیب زمینی کیا۔ ایرانیوں نے اسے آلوئے مالکم بھی کہا کیونکہ اسے ایران میں سر جان مالکم' جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک افسر تھا۔ اس نے روشناس کرایا تھا آلو کے معنی فارسی اور سنسکرت میں زمین کے اندر دبی ہوئی جڑ کے ہیں۔ بنگالی میں اسے ولایتی آلو کا نام دیا گیا۔ یورپ کے ملکوں میں اس کے مختلف نام ہیں اٹلی میں اسے ٹارٹوفل کہا تو اہل جرمن اسے کارٹوفل کہتے ہیں۔

جب اہل ہسپانیہ نے جنوبی امریکہ پر قبضہ کیا تو انہوں نے آلوؤں کا استعمال اس لئے نہیں کیا کہ یہ مقامی لوگوں کی غذا تھی جو کہ ان کے نزدیک کم تر مخلوق تھی بعد میں انہوں نے اسے غلاموں کی غذا بنایا اور آگے چل کر انگلستان نے بھی اس پر عمل کیا اور اسے آئر لینڈ کے لوگوں کے لئے بطور غذا روشناس کرایا۔

اگرچہ اہل سپین آلوؤں کو سولھویں صدی میں یورپ لے آئے تھے مگر اس کا استعمال آہستہ آہستہ ہوا جیسا کہ ہر نئی چیز کے استعمال میں ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں لوگوں کو شک و شبہات ہوتے ہیں تعصبات ہوتے ہیں اور اسے تسلیم کرنے میں جھجک ہوتی ہے یہی کچھ آلوؤں کے ساتھ تھا اور اس لئے لوگوں میں اور زیادہ شبہات تھے کیونکہ اس کا ذائقہ بھی مختلف تھا اور اس ذائقہ کو قبول کرنے میں انہیں وقت درکار تھا۔ اس لئے اول اس کو کئی طرح سے پکایا گیا۔ ابال کر' بھون کر اور مختلف مسالوں اور شراب میں ملا کر تیار کیا گیا۔ اس کے جہاں اور فوائد بتائے گئے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اس کے کھانے سے جنسی خواہشات بڑھتی ہیں لیکن ساتھ ہی میں اس کے خلاف پروپیگنڈہ بھی کیا گیا کہ اس سے کوڑھ کا مرض ہوتا ہے لہٰذا ۱۷۷۱ء میں اس کے بارے میں اس قدر شبہات تھے کہ فرانس کی حکومت نے پیرس یونیورسٹی کے شعبہ میڈیسن سے یہ درخواست کی کہ اس کے بارے میں اپنی رائے دے' اس کی رپورٹ کے مطابق آلو کا استعمال صحت کے لئے اچھا تھا۔

جرمنی کی ریاست پروشیا میں بھی عام لوگ آلوؤں کے استعمال کے خلاف تھے' اس لئے جب ۱۷۷۴ء میں فریڈرک دی گریٹ نے آلوؤں کو کولبرگ بھجوایا کہ جہاں شدید غذائی قلت تھی تو لوگوں نے اس کے استعمال سے انکار کردیا اور کہا کہ نہ تو ان میں کوئی بو ہے' نہ ذائقہ اس لئے انہیں کتے بھی کھانا پسند نہیں کرتے' اس پر فریڈرک نے فوج بھیج کر کسانوں کو مجبور کیا کہ وہ اس کی کاشت کریں۔

یہی صورت حال انگلستان اور دوسرے ملکوں میں بھی تھی کہ جہاں آہستہ آہستہ آلوؤں کے بارے میں تعصبات ختم ہوئے۔ آلوؤں کی کاشت کو مقبول بنانے میں حکمران طبقوں کے بھی مفادات تھے کیونکہ یہ ایک سستی غذا تھی اور اس سے لوگوں میں بھوک کو روکا جاسکتا تھا لیکن جیسا کہ دستور ہے کہ ہر نئی چیز کو اپنانے میں دشواریاں ہوتی ہیں اسی لئے آلو کو بھی بطور غذا کئی مرحلوں کے بعد تسلیم کیا گیا انگریزوں نے اس کی مخالفت اس لئے بھی کہ کہ یہ اہل آئر لینڈ کی غذا ہے جو کہ ان سے کم تر تھے۔

غذا سے معاشرے میں سماجی رتبہ بھی متعین ہوتا ہے کوئی کیا کھاتا ہے؟ اس سے طبقاتی تعلق کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے اس طرح آلوؤں کی مختلف اقسام سے معلوم ہوجاتا تھا کہ اس کے کھانے والے کون لوگ ہیں؟ مثلاً" اٹھارویں صدی اور ابتدائی انیسویں صدی میں غریب لوگ Lumders کھاتے تھے جب کہ امراء Gregorscup۔

یورپ کے اور ممالک کے مقابلہ میں آلو نے آئر لینڈ کی سماجی و سیاسی اور معاشی تاریخ پر گہرے اثرات ڈالے سترھویں صدی میں آب و ہوا کے موافق ہونے کی وجہ سے اس کی خوب کاشت ہوئی۔ اور بہت جلد یہ لوگوں کی غذا بن گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آئر لینڈ میں انگلستان کا تسلط تھا اور یہاں جو اناج پیدا ہوتا تھا وہ قرضے میں چلا جاتا تھا ان کی صنعت و حرفت کو اس لئے فروغ نہیں ملا کہ انگلستان اسے اپنا حریف نہیں بنانا چاہتا تھا۔ سیاسی پسماندگی' انگلستان کے خلاف بغاوتوں کی مسلسل ناکامی' لیڈروں کا قتل یا ملک سے فرار' جبر و تشدد' خانہ جنگیوں کی وجہ سے مویشیوں کی کمی' جنگلات کی تباہی' قحط اور خشک سالی ان حالات میں جو خلا پیدا ہوا تھا اسے آلوؤں نے

پورا کیا۔ ۱۸۰۱ء میں انگلستان و آئرلینڈ کا اتحاد ہوگیا مگر اس سے آئرلینڈ کو فائدے کے بجائے نقصان ہوا۔ اس وقت تک ۹/۱۰ آبادی کی غذا آلو بن چکے تھے اس لئے جہاں آلوؤں کی فصل کو نقصان ہوتا تو وہاں قحط آجاتا تھا۔

اسی لئے بدترین قسم کا قحط ۴۶-۱۸۴۵ء میں پڑا کہ جب آلوؤں کی فصلیں خراب ہوگئیں۔ اس قحط نے اس بات کو ثابت کیا کہ محض آلوؤں پر انحصار یہ ساری تباہی لے کر آیا۔ اس قحط کے نتیجہ میں ہزارہا لوگ بھوک اور فاقے سے مر گئے ہزارہا ہجرت کرگئے اور حکومت قحط کو ختم کرنے میں پوری طرح ناکام ہوگئی۔ بے روزگاری میں اضافہ ہوا اور اس کی وجہ سے انگلستان کی فیکٹری کو سستی مزدوری آسانی سے مہیا ہوگئی۔ آلوؤں کا قحط آئرلینڈ کی تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے لیکن اس میں آلوؤں کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا کیونکہ اصل وجہ آئرلینڈ کے خلاف انگلستان کی پالیسی تھی جس نے ان کی صنعت و حرفت تباہ کرکے ان کی بے روزگاری میں اضافہ کیا۔ اور انہیں اقتصادی طور پر اس قدر مجبور کیا کہ وہ آلو جیسی سستی غذا پر انحصار کرنے لگے۔

سولومن کا تجزیہ یہ ہے کہ انگلستان میں آلو اس وقت غذا کے طور پر استعمال ہونا شروع ہوا جب کہ وہاں صنعتی دور شروع ہوا اور سرمایہ دار نے کم اجرت پر مزدوروں سے کام لے کر انہیں اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اپنے گزارے کے لئے آلوؤں کو جو سستی غذا ہے استعمال کریں۔

اس کے برعکس آئرلینڈ میں اسے اوپر سے نافذ نہیں کیا گیا بلکہ وہاں کے سماجی اور معاشی حالات نے لوگوں کو خود مجبور کیا کہ وہ اسے استعمال کریں خصوصیت سے سترھویں صدی کی جنگوں نے اس کے استعمال کو بڑایا اس نے آگے چل کر پس ماندہ معاشرے کو ایک نہ ختم ہونے والے چکر میں پھنسا دیا ' مثلاً" غربت' اس کا علاج آلو اور بڑے خاندان ان کی ضروریات کے لئے زیادہ آلو اور اس کے نتیجہ میں اور زیادہ غربت ان کی ضروریات کے لئے اور زیادہ آلو اور اس کے نتیجہ میں اور زیادہ غربت۔ اب اس کا انجام یا تو انقلاب میں ہوسکتا تھا یا تباہی میں۔ آئرلینڈ کے کیس میں اس کا

انجام تباہی میں ہوا۔

آلوؤں نے ۳۰ سال تک آئرلینڈ میں غربت و مفلسی کو برقرار رکھا' ان کی وجہ سے اجرت کم رہی اور آبادی بڑھتی رہی مشہور معیشت داں مالتھوس نے لکھا ہے کہ اگر لوگ سادہ کھانے ' غریبانہ لباس اور کچے و چھوٹے مکانوں سے مطمئن ہوجائیں تو اس کے نتیجہ میں ان میں کوئی خواہش و جذبہ باقی نہیں رہے گا کہ وہ اپنی حالت بدلیں اور بہتر غذا ' لباس اور رہائش کے لئے جدوجہد کریں۔ اس اطمینان سے ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے تمام جذبات ختم ہوجاتے ہیں۔ اس سے سولومن نے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر کوئی طاقت ور جماعت یا قوم اپنے سے کمزور اور ماتحت کو اس بات پر مجبور کردے کہ وہ زندہ رہنے کے لئے سستا کھانا کھائے تو اس سے لازمی طور پر اس کا معیار زندگی گر جائے گا اور جتنا معیار زندگی گرے گا اسی قدر اس کا استحصال آسان ہوجائے گا اور اسے غلامی پر مجبور کیا جاسکے گا۔

آلو نے اس استحصالی عمل کو آسان بنانے میں طاقت ور جماعتوں کی مدد کی۔ معتدل آب و ہوا' کم رقبہ میں زیادہ کاشت اس نے مزدوروں کو سستی غذا فراہم کرکے معاشروں میں طبقاتی نظام کو اور زیادہ مضبوط کیا۔ اس کی مثال اٹھارویں صدی کا برطانیہ ہے کہ جہاں آزاد تجارت کو سیاسی ہتھیار کے طور پر استعمال کرکے حکمراں طبقے نے مزدوروں کا استحصال کیا اور اس کی کم اجرت مقرر کرکے اسے مجبور کیا کہ وہ آلو کو سستی غذا کے طور پر استعمال کرے۔ لہٰذا آلو نے ایک طرف غذا کا کام کی اور دوسری طرف کمزور اور غریب طبقوں کا استحصال کیا۔

○

روزمرہ زندگی کا نقشہ

(یورپ پندرھویں و اٹھارویں صدی میں)

فرانس کے مشہور تاریخی اسکول "آنلز" نے تاریخ نویسی میں نئے رجحانات کو روشناس کرایا ہے' انہوں نے "مکمل تاریخ" کا نقطہ نظر دیا ہے کہ جس کے تحت معاشرہ کی مکمل تاریخ' جس کا تعلق لوگوں سے ہوتا ہے لکھی جاتی ہے۔ اس میں سیاسی تاریخ کو کم درجہ دیا گیا ہے اور ان سماجی و معاشی پہلوؤں پر زیادہ زور دیا ہے کہ جنہوں نے خاموشی اور آہستگی کے ساتھ تبدیلیاں کیں اور سماج اور اس کی قدروں کو بدلا۔

فرنانڈ براوؤڈل (F. Braudel) اس مکتبہ فکر کا اہم مورخ ہے کہ جس نے "بحر روم" کے نام سے ایک مفصل اور جامع تاریخ لکھی ہے' اس نے "تہذیب اور سرمایہ داری" کے عنوان سے تین جلدوں میں ایک کتاب لکھی ہے' جس کی پہلی جلد "روزمرہ کی زندگی اور اس کا نظام" ہے' اس میں اس نے ۱۵ ویں صدی سے لے کر ۱۸ ویں صدی تک یورپ میں عالمی تاریخ کے پس منظر میں جو سماجی و ثقافتی' تبدیلیاں ہوئی تھیں اور جن کا اثر روزمرہ کی زندگی پر پڑا' اس کی تفصیل دی ہے۔ اس کا فرانسیسی ایڈیشن ۱۹۷۳ء میں چھپا تھا اور انگریزی ایڈیشن ۱۹۸۱ء اور ۱۹۸۵ء میں چھپے۔

براوؤڈل نے ابتداء میں ان وجوہات اور عناصر کی طرف توجہ دلائی جو غیر متمدن قبائل اور تہذیب یافتہ قوموں کے تصادم کے نتیجہ میں تبدیلی لاتے ہیں' تاریخ میں یہ ہوا ہے کہ جب بھی خانہ بدوش قبائل نے مہذب قوموں پر حملے کئے اور ان پر فتوحات حاصل کیں تو اس کے دوسرے مرحلے میں تہذیبی طور پر وہ ان سے شکست کھا کر ان

سے مل گئے۔ اس کی مثال عرب' ترک' منگول' منچو اور تاتار قبائل ایشیا میں اور جرمن قبائل یورپ میں ہیں کہ جنہوں نے بڑی بڑی سلطنتوں کو تو شکست دی مگر آخر میں انہیں تہذیبی روایات میں گرفتار ہو کر اس کا حصہ بن گئے۔

ان خانہ بدوش قبائل کی کامیابی کا راز یہ رہا ہے کہ یہ صحراؤں' ریگستانوں اور اسٹیپس میں رہتے تھے کہ جہاں سادہ غذا' فطرت کی سختیاں اور غیر محفوظ ماحول انہیں چست و چالاک اور ہمیشہ کے لئے چاق و چوبند رکھتا تھا' اس لئے ان میں رفتار کی تیزی اور فیصلہ کی جلدی ہوتی تھی اور یہ دونوں چیزیں متمدن اور تہذیب یافتہ دنیا میں کمی کے ساتھ تھیں' اس لئے وہ ان علاقوں میں قبضہ کرتے تھے کہ جو کم آبادی والے ہوتے تھے اور بعد میں شہروں پر حملے کرکے ان پر قابض ہوجاتے تھے۔ تاریخ سے خانہ بدوشوں کے حملے اس وقت ختم ہوئے کہ جب بارود کا استعمال ہوا' اس کے بعد سے بڑے شہر محفوظ ہوگئے۔

تاریخی عمل میں تہذیبیں فتح مند ہوتی ہیں اور یہ غیر متمدن قوموں کو یا تو ختم کردیتی ہیں یا انہیں اپنے میں شامل کرلیتی ہیں۔ تہذیبیں خالی علاقوں پر قابض ہوکر انہیں اپنے رنگ میں رنگ لیتی ہیں۔ جیسے اہل یورپ نے امریکہ' روس نے سائبریا' برطانیہ نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ پر قبضے کرلئے۔ کم آبادی والے علاقوں پر قبضہ کرکے متمدن قوموں نے وحشیانہ طور پر وہاں کے باشندوں کا قتل عام کردیا جیسے پرتگیزی اہسپانیوں نے لاطینی امریکہ میں' برطانوی اور فرانسیسیوں نے شمالی امریکہ میں مقامی باشندوں کا صفایا کردیا' کیونکہ انہیں لوگوں کی نہیں' زمین کی ضرورت تھی۔

مگر تاریخ میں ہمیشہ ہی سے نیم ثقافت یا ناپختہ تہذیب ختم نہیں ہوتی ہے بلکہ وقت آنے پر یہ دوبارہ سے واپس آتی ہے' جیسا کہ افریقہ میں نو آبادیات کے زمانہ میں وہاں کے مقامی کلچر کو دبا دیا گیا تھا' مگر آزادی کے بعد افریقی ملکوں میں اپنی قدیم ثقافت کا احیاء ہو رہا ہے اور وہ اپنی شناخت اس کی روایات میں تلاش کر رہے ہیں۔

یہ تصادم پختہ تہذیب اور نیم پختہ کلچر ہی میں نہیں بلکہ دو مکمل تہذیبوں میں بھی

ہوتا ہے جیسا کہ مغربی تہذیب اور ہندوستانی' اسلامی اور چینی تہذیبوں کے درمیان ہوا نو آبادیاتی دور میں تو ان کی شناخت دبی رہی' مگر اب ان تہذیبوں کا احیاء ہو رہا ہے۔

انسانی معاشرہ میں غذا کی اہمیت سب سے زیادہ ہوتی ہے' اس لئے براوڈل نے ان تبدیلیوں کی نشان دہی کی ہے کہ جو غذا کی وجہ سے ہوئیں' اس کے نقطہ نظر کے تحت پندرھویں سے اٹھارویں صدی تک ایشیا' افریقہ اور قبل کولمبس کے امریکہ میں سبزی کھانے کا رواج تھا اور زراعتی علاقوں میں آبادی اس لئے بڑھی کہ ان کے یہاں سبزی و اناج کو محفوظ کیا جانے لگا' گوشت چونکہ جلدی خراب ہوجاتا تھا اس لئے اس کا استعمال کم ہوا' مزید یہ کہ جانور اور مویشی کاشت کاری میں کام آتے تھے اس لئے ان کی حفاظت کی جانے لگی۔ گوشت مالدار اور اونچے لوگوں کی غذا رہا' اس لئے ایک جرمن کہاوت ہے کہ آدمی جو کھاتا ہے اس سے اس کے سماجی رتبہ کا اندازہ ہوتا ہے' یورپ میں گوشت کا استعمال اس وقت بڑھا جب امریکہ کی دریافت کے بعد سے مویشیوں کی بہتات ہوئی' اور گوشت کو نمک و برف میں محفوظ کیا جانے لگا۔

ابتداء میں روٹی کا رواج نہیں تھا اور اناج سے سوپ تیار کیا جاتا تھا اور وہی عام لوگوں کا کھانا تھا' بعد میں اناج کو پیسا جانے لگا اور اس سے مختلف قسم کی روٹیاں تیار ہونے لگیں۔ ان میں سفید اور خمیری روٹی صرف امراء کے لئے مخصوص تھی۔ جب روٹی غذا کا ایک حصہ بن گئی تو اس کی کمی سے قحط کی صورت حال پیدا ہوجاتی تھی۔ اس کی وجہ سے یورپ میں کئی بڑے فسادات ہوئے' فرانسیسی انقلاب کی ایک وجہ بھی روٹی کی کمی تھی۔

چاول چین' ہندوستان سے شروع ہوا اور پھر تبت' انڈونیشیا اور جاپان میں ۷ ویں صدی میں) مقبول ہوا' اس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ کم جگہ پر زیادہ ہوتا ہے' اور اس کے لئے پانی کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے اس لئے اس کی کاشت پر ریاست کا کنٹرول تھا' چاول نے چین اور مشرق بعید کی تہذیبوں کی ترقی میں بڑا حصہ لیا۔

چاول کے بعد مکئی نے انسانی معاشرہ کو متاثر کیا' اس کا رواج انکا' مایا اور ایزٹک

تہذیبوں میں تھا' چونکہ اس کی کاشت میں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑتی تھی اس لئے کسانوں کو فرصت میسر آتی تھی' مگر ریاست نے ان فرصت کے لمحوں کو اپنے لئے استعمال کیا اور ان سے عظیم الشان مذہبی عمارتیں تعمیر کرائیں۔ جنوبی امریکہ کے لئے مذہبی معاشرے کے استحکام میں مکئی کی کاشت کا حصہ ہے' مایا اور ایزٹک تہذیبوں میں جو اہرام تعمیر ہوئے وہ بھی کسانوں کی محنت کا نتیجہ ہیں' اس لئے اگرچہ تہذیبیں تو پیدا ہوئیں' انہوں نے ترقی بھی کی' مگر اس عمل میں عام انسان اذیت و دکھ میں مبتلا رہا۔

سولھویں صدی تک یورپ کے مقابلہ میں چین اور ہندوستان میں گوشت کم کھایا جاتا تھا' ہندوستان میں ایک عام آدمی کی غذا کھچڑی تھی' چین میں سبزی کا رواج تھا' جب کہ ترکی' مصر اور دوسری مشرق وسطی کے ملکوں میں گوشت کھایا جاتا تھا۔

گوشت کو محفوظ رکھنے اور کھانوں کو ذائقہ دار بنانے کے لئے نمک کا استعمال ہونا شروع ہوا تو ریاست نے اس پر ٹیکس لگا کر اسے اپنی آمدنی کا ذریعہ بنایا' دودھ' دہی اور پنیر کا استعمال یورپ اور ایشیا کے ملکوں میں ہوتا تھا' مگر چین اور جاپان میں انہیں استعمال نہیں کیا جاتا تھا۔ مکھن کا استعمال یورپ میں اٹھارویں صدی میں ہوا اسی طرح انڈا' چین جاپان اور ہندوستان میں کم استعمال ہوتا تھا۔

مسالوں میں کالی مرچ کا استعمال رومیوں کے زمانہ سے یورپ میں شروع ہوگیا تھا' بعد میں اہل مغرب کی تجارت مسالوں کے حصول کی وجہ سے مشرق سے بڑھ گئی اور یہ ان کے بدلہ میں سونا' چاندی اور قیمتی دھاتیں دیتے تھے' مگر اس تجارت نے ان کے لئے دنیا کے راستے کھول دیئے۔

گنے کی کاشت بنگال کے ساحل پر ہوتی تھی' یہاں سے یہ دوسرے علاقوں اور ملکوں میں پھیلا' آٹھویں صدی میں یہ چین میں متعارف ہوا' دسویں صدی میں مصر میں اس سے شکر نکالی جانے لگی' یورپ کو اس سے واقفیت صلیبی جنگوں کے دوران ہوئی' اگرچہ عرب اسے سسلی اور ہسپانیہ لے جاچکے تھے۔ ۱۵۲۰ء میں یہ برازیل پہنچا اور سترھویں صدی میں جزائر عرب الہند' جہاں بہت جلد اس کی بڑے پیمانے پر کاشت

ہونے لگی جس میں افریقہ سے لائے ہوئے غلاموں کو استعمال کیا گیا۔

جہاں تک پینے کا تعلق ہے' انسان نے ابتداء میں پانی کو بطور مشروب استعمال کیا کیونکہ اس کا حصول آسان تھا' یہ بارش' دریا' چشمے' تالاب اور کنویں سے مل جایا کرتا تھا۔ اسے برتنوں یا مشکیزہ کے ذریعہ بعد میں گھر گھر پہنچایا جاتا تھا۔ چین میں ابلا ہوا پانی پینے کا رواج تھا جس کی وجہ سے وہ بہت سی پانی کی بیماریوں سے محفوظ رہے' باقی ملکوں میں پانی کو ٹھنڈا کر کے پینے کا رواج تھا۔

شراب' انگور' چاول اور کھجور سے کشید کر کے بنائی جاتی تھی' ابتداء میں شراب خانے وہ مرکز تھے کہ جہاں لوگ آپس میں ملتے تھے اور شراب کے دور بھی چلا کرتے تھے بیر قدیم چین' بابل اور مصر میں تھی' یورپ میں اسے غریب لوگ پیا کرتے تھے۔ برانڈی اور اسپرٹ ۱۶' ۱۷ اور ۱۸ صدیوں میں یورپ میں مقبول ہوئیں۔ اس کے علاوہ ایشیا و افریقہ میں ان کی اپنی تیار شدہ شرابیں ہوا کرتی تھیں۔

شراب کے علاوہ پینے کی چیزوں میں کافی' چائے اور چاکلیٹ کا رواج بھی ہو گیا تھا' کافی حبشہ سے عرب میں آئی اور پھر یہاں سے دوسرے ملکوں میں پھیلی' چائے چین سے شروع ہوئی اور چاکلیٹ میکسیکو سے اسپین آیا اور پھر دوسرے یورپی ملکوں میں روشناس ہوا۔ چائے بہت جلد یورپ میں مقبول ہو گئی اور اس نے شراب کی جگہ لے لی۔

کافی کو مقبول کرنے میں کئی ملکوں نے ہچکچاہٹ کا اظہار کیا' خاص طور سے مسلمان ملکوں میں ۱۵۱۱ء میں اس پر مکہ میں پابندی لگا دی گئی' ۱۵۱۰ء میں قاہرہ میں اور ۱۵۱۷ء میں استنبول میں اس کے استعمال کے خلاف فتویٰ صادر کئے گئے' مگر ان پابندیوں کے باوجود اس کا استعمال بڑھتا گیا یہاں تک کہ یہ پورے مشرق وسطیٰ میں پھیل گئی۔ یورپ میں ۱۶۱۵ء میں وینس آئی اور پھر دوسرے ملکوں میں اس کا استعمال پھیلا ۱۶۷۷ء میں پیرس میں کافی اسٹال قائم ہو چکے تھے۔

براوڈل کا کہنا ہے کہ ہر تہذیب میں کھانے و پینے کی ندرت اور نیا پن ہوتا ہے

اور افراد کو ایسی اشیاء درکار ہوتی ہیں کہ جو ان میں جذبات کو ابھاریں' لہٰذا یورپ میں ۱۲ سے لے کر ۱۳ ویں تک مسالہ جات نے یہ فریضہ سرانجام دیا ۱۶ویں صدی میں الکوحل نے اس کی جگہ لے لی اور ۱۷ سے ۱۸ ویں صدی تک چائے' کافی اور تمباکو آگئے' تمباکو کی مقبولیت سولہویں صدی میں جاکر ہوئی اس کو لانے والا کولمبس تھا جو ۱۴۹۲ء میں اسے کیوبا سے لے کر آیا اور اسے ابتداء میں بطور دوا کے استعمال کیا مثلاً" ۱۵۶۰ء میں لزبن میں فرانسیسی سفیر نے اسے کیتھرائین آف میڈیچی کو اس کے سر درد کی دوا کے طور پر بھیجا تھا اس کی کاشت ۱۵۵۸ء میں اسپین سے شروع ہوئی اور فرانس و انگلستان تک جاپہنچی ابتداء میں تمباکو کی بھی مخالفت ہوئی اور اسے انگلستان' جاپان اور عثمانی سلطنت' مغل سلطنت' ڈنمارک' روس اور چین میں ممنوع قرار دیا گیا مگر ان پابندیوں کے باوجود اس کا استعمال بڑھتا رہا' اسنف کی شکل میں اسے سونگھا جاتا تھا چبایا جاتا تھا' پائپ یا سگار کی شکل میں پیا جاتا تھا اور بعد میں کاغذ میں لپیٹ کر اسے سگریٹ کی شکل دی گئی اور یہ فرانس کے نوجوانوں میں خصوصیت سے مقبول ہوگیا۔

مشرق اور مغرب میں فرنیچر کا استعمال رہا ہے' مشرق میں زیادہ تر نیچے فرش پر بیٹھنے کا رواج تھا اور مغرب کی طرح کی میز اور کرسیاں نہیں ہوتی تھیں کھانا بھی نیچے فرش پر بیٹھ کر کھایا جاتا تھا' ہندوستان میں اکڑوں بیٹھ کر کاغذ یا تختی گھٹنے پر رکھ کر لکھا کرتے تھے میز' کرسی کا استعمال یہاں یورپیوں کی آمد سے شروع ہوا' مثلاً" لفظ میز پرتگیزی میسا (Mesa) ہے جو پہلے تامل زبان میں آیا اور پھر ہندوستان کی دوسری زبانوں میں رائج ہوا۔ بیٹھنے کے اس فرق میں بھی ایک پرتگالی پادری نے اپنی برتری نکالی اور ۱۵۴۲ء میں اس نے کہا تھا کہ ہم عیسائی اونچائی پر بیٹھتے ہیں اور جانوروں کی طرح زمین پر نہیں بیٹھتے۔

لباس کا تعلق موسم اور فیشن سے ہوتا ہے' جب دنیا کی قوموں میں باہمی رابطے ہوئے تو انہوں نے ایک دوسرے سے سیکھا' خصوصیت سے فاتح اقوام کے لباس کو مفتوح قوموں نے اختیار کرلیا جیسے مغل جو لباس وسط ایشیا و ایران سے لائے تھے وہ

ہندوستان میں رائج ہوگیا' لیکن کچھ لباس ایسے ہوتے ہیں کہ جو ہمیشہ برقرار رہتے ہیں اور تمام تہذیبوں کے باوجود ان کا رواج رہتا ہے جیسے ہندوستان میں دھوتی و تہمبند اور جاپان میں کامینو۔

لباس سے انسان کی سماجی حیثیت کا بھی تعین ہوتا ہے۔ جہاں تک فیشن کا تعلق ہے تو یہ محدود طبقے میں رہتا ہے کیونکہ اس کا تعلق جدت سے ہوتا ہے اور جلدی تبدیلی وہی قبول کرسکتے ہیں جو کہ مالی طور پر اس قابل ہوتے ہیں۔

انسانی تاریخ کی ابتداء میں لباس کی تبدیلی بہت کم ہوئی اس لئے یورپ میں ۱۲ ویں صدی تک رومی لباس پہنا جاتا رہا' ۱۳۵۰ء میں جاکر مردوں کے لباس مختصر ہوئے اور اس قدر چست کے جسم کے تمام اعضا نمایاں ہوں' اس لئے اس قسم کے لباس پر قدامت پرستوں کی جانب سے احتجاج ہوا۔ عورتوں کے لباس بھی چست ہوئے اور ان کی قمیضوں کے گلے نیچے آگئے۔ سپین کا کالا لباس ایک عرصہ تک یورپ کے امراء میں مقبول رہا۔ سترھویں صدی میں جاکر فرانس میں بھڑکیلے کپڑوں کا رواج ہوا۔

فیشن کو مقبول بنانے میں تجارتی اغراض شامل تھیں' مگر اس کے ساتھ ہی ایک طبقے کی یہ خواہش تھی کہ وہ دوسرے سے جدا نظر آئے۔ فیشن کا اثر بادشاہوں اور چرچ کے راہبوں کے لباس پر نہیں ہوا اور یہ روایتی رہے۔

چین نے طویل عرصہ تک سلک بنانے کے طریقے کو خفیہ رکھا اور یورپ میں جسٹی نین (۶۵ - ۱۵۲۷) زمانہ میں یہ روشناس ہوا' جب کہ ایک عرصے تک ہندوستان کا بنا ہوا کپڑا یورپ میں عام تھا۔

رومیوں کے زمانہ تک تو نہانے کا رواج تھا اور رومیوں نے پبلک باتھ بنوائے تھے۔ لیکن ۱۰۱ء میں جاکر حماموں کا رواج کم ہوگیا اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ لوگ متعدی بیماریوں سے ڈر گئے' بعد میں آتشک کی بیماری پھیلی تو اس نے اور زیادہ حماموں کے رواج کو کم کردیا۔ بعد میں کیتھولک اور کال ون چرچ نے بھی نہانے کی مخالفت کی۔ فرانس کے لوئی چہاردھم کے زمانہ تک غسل کرنے کا رواج بہت کم تھا' اور اگر

نہایا بھی جاتا تھا بطور علاج کے ۱۸۰۰ تک لندن میں کوئی حمام نہ تھا۔

ابتداء میں توانائی کا ذریعہ خود انسان تھا وہ وزن اٹھاتا تھا اسے کھینچتا تھا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتا تھا' بعد میں اس نے یہ کام جانوروں سے لیا' جن میں گھوڑا' گدھا' اونٹ' ہاتھی اور بیل اور گائے ہیں۔ اس کے بعد کے مرحلے میں پانی اور ہوا سے چلنے والے انجن ایجاد ہوئے اٹھارویں صدی میں لکڑی اور تارکول نے توانائی مہیا کی۔ انیسویں صدی میں کوئلہ توانائی کا سب سے بڑا ذریعہ بنا۔ اور معاشرے میں سماجی اور اقتصادی تبدیلیاں لے کر آیا۔

۱۴۵۸ء میں گٹن برگ نے چھاپے خانہ کی ایجاد کی۔ اور ۱۵۵۷ء میں پرتگیریوں نے گوا میں پریس لگا دیا' مگر اس کا اثر مغلیہ سلطنت پر نہیں ہوا' لیکن چھاپہ خانوں کی ایجاد نے یورپ میں علم کو پھیلانے میں زبردست حصہ لیا اور سولہویں صدی میں فرینکفرٹ اور سترھویں صدی میں لائپزش میں کتابوں کے میلے ہونے لگے تھے۔

تاریخی عمل میں شہر اور دیہات کی تقسیم بھی انتہائی اہم ہے' یہ انسانی معاشرے میں محنت کی تقسیم کو ظاہر کرتے ہیں۔ کھیتوں میں کام کرنے والے دیہاتوں میں آباد رہے جب کہ ذہنی و دماغی کام کرنے والے شہروں میں بس گئے۔ بقول کارل مارکس شہروں اور دیہاتوں کا تصادم اس وقت سے شروع ہوا جب کہ غیر متمدن زمانہ متمدن زمانہ میں مل گیا قبائلی نظام ریاست میں تبدیل ہوگیا اور یہ تبدیلی ابتدائی تاریخی زمانہ سے لے کر موجودہ زمانہ تک آئی ہے۔"

تہذیب و تمدن کی پرورش و ترقی شہروں میں ہوئی ہے اور ان ہی کی سرگرمیوں سے تاریخ بنی ہے۔ شہروں کی آبادی اور ان کی ترقی کی وجہ سے اٹلی میں تحریک نشاۃ ثانیہ پیدا ہوئی' قدیم یونان میں شہری' جمہوریتیں شہروں میں پروان چڑھیں۔ اسلامی عہد میں کوفہ' دمشق اور پھر بغداد تہذیب و تمدن کا مرکز بنے۔

یہ صحیح ہے کہ شہر کا انحصار دیہات کی پیدوار پر ہوتا ہے اور وہ غذائی ضروریات اور سستی مزدوری کے لئے دیہات کے کسانوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ ایک

دوسرے سے انتہائی قریبی تعلق رکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں۔

چونکہ شہروں میں تجارتی منڈیاں ہوتی ہیں مال و دولت ہوتا ہے' حکمران طبقوں کی رہائش ہوتی ہے' اس لئے وہ اس کی حفاظت کرنے کے لئے فصیلیں اور قلعہ تعمیر کراتے ہیں۔ یہ شہر چھوٹے قصبوں اور گاؤں سے تعلیم یافتہ لوگوں کو اپنے اندر ضم کرلیتا ہے۔ اس لئے چھوٹے شہر اور دیہات ہمیشہ پسماندہ رہتے ہیں۔

ابتداء میں شہر کی حفاظت کے لئے چونکہ دیواریں بنائی جاتی تھیں اس لئے یہاں تنگ گلیاں ہوتی تھیں لیکن بعد میں جب کوچ اور گھوڑا گاڑی کا رواج ہوا تو چوڑی سڑکیں بننے لگیں۔

ہر شہر کے مضافات ہوتے تھے مضافات میں اکثر طوائفیں اور غنڈے رہتے تھے تاکہ وہ شہر کے قانون سے دور رہ سکیں۔ اٹھارویں صدی میں یورپ میں شہروں میں سہولتیں آئیں۔ مثلاً" فٹ پاتھ بنائے گئے' شاہراہوں پر روشنی کے لیمپ لگائے گئے' پینے کے پانی کی سپلائی شروع ہوئی اور لندن و پیرس میں مکانوں پر نمبر ڈالے گئے۔

ریاست کے عروج نے شہروں کو ترقی عطا کی کیونکہ جس قدر ریاست منظم ہوتی ہے اسی قدر شہر ترقی کرتے ہیں۔

○

فرد اور ادارے

وہ تمام سیاسی نظام کے جن میں فرد تمام قوت و طاقت کو اپنی ذات میں جمع کرلیتا ہے اس کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے اختیارات کو محفوظ رکھنے کی خاطر ان تمام اداروں کو تباہ و برباد کردے یا انہیں کمزور کردے کہ جن کی جانب سے اسے اپنے اقتدار کے چھن جانے کا خطرہ ہوتا ہے' اس کی مثال نظام بادشاہت میں ' حکمران کی ذات سے دی جاسکتی ہے کہ جو مطلق العنان ہوتا ہے اور ریاست کے تمام ادارے اس کی خواہشات کے ماتحت ہوتے ہیں اور جیساکہ تاریخ کی شہادتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکمران کی اپنی خواہشات و منصوبے ہوتے تھے اور ان کے مطابق وہ اداروں کو مجبور کرتا تھا کہ اس کی خواہشات کی تکمیل کے لئے خود کو تبدیل کریں۔ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا تھا کہ یہ تبدیلیاں اداروں کو مستحکم ہونے کا موقع نہیں دیتی تھیں اور ان کے لئے ناممکن ہوجاتا تھا کہ وہ معاشرے کی تعمیرو تشکیل میں کوئی اہم کردار ادا کرسکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انفرادی حکمرانی قائم رہی اور اسی لئے لوگوں نے مسائل کے حل کے لئے اداروں سے زیادہ انفرادی شخصیتوں کی طرف رجوع کیا اور ان سے مدد طلب کی۔

اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور میں اس بات کی کوشش ہوئی کہ خلافت کے ادارے کو مستحکم بنیادوں پر قائم کیا جائے۔ مگر بدلتے حالات اور ضرورتوں کے تحت خلافت کی جگہ بادشاہت نے لے لی' اور اس کے ساتھ ہی فرد کی مطلق العنانیت پوری طرح سے قائم ہوگئی اور مسلمان حکمرانوں نے بازنطینی اور ساسانی بادشاہوں کی رسومات اور

طور طریق کو اختیار کر کے تمام ریاستی اداروں کو اپنے ماتحت کرلیا۔ طاقت کے اس اجتماع کے بعد کسی بھی ادارے کے لئے یہ ناممکن ہوگیا کہ وہ حکمران کے اختیارات کو چیلنج کرسکے اور اگر اسے کسی سے ذرا بھی خطرہ محسوس ہوا تو اس کے اثرات کو فوری طور پر ختم کردیا' اس کی مثال ہارون الرشید (۷۸٦ ـ ۸۰۹) سے دی جاسکتی ہے کہ جس کے برمکی خاندان سے گہرے تعلقات تھے لیکن جب جعفر برمکی کا بحیثیت وزیر کے اثر و رسوخ بڑھنا شروع ہوا تو اس نے فوراً" جعفر کو قتل کرا دیا اس کے خاندان کو تتر بتر کردیا اور اس طرح وزارت کے ادارے کو کمزور کردیا۔

یہی صورت حال عثمانی دور حکومت میں آئی کہ جس میں ینی چری جس کو اردو میں اکثر غلطی سے جاںثاری کہا جاتا ہے' اس فوجی دستے نے عثمانہ سلطنت کے پھیلاؤ اور فتوحات میں اہم حصہ لیا لیکن بعد میں جیسے جیسے یہ ادارہ مضبوط ہوتا چلاگیا اور اس نے حکمران کے اختیارات میں دخل دینا شروع کردیا تو اس کے نتیجہ میں عثمانی حکمرانوں نے تمام ینی چری فوجیوں کو قتل کرا کر اس ادارے کو مکمل طور پر ختم کردیا۔ اس قسم کے واقعات اسلامی اور دوسری تاریخوں میں بہت ہیں۔

اس کا منطقی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جب ادارے کمزور ہوں اور فرد طاقت ور تو لوگ مسائل کے حل کے لئے افراد کی طرف توجہ دینے لگتے ہیں یہی وجہ تھی کہ مسلمان معاشرہ میں حکمرانوں اور شہزادوں کے لئے ایک خاص قسم کا ادب تشکیل ہوا' جس کا مقصد یہ تھا کہ ان کے کردار و عادات و اطوار کو ابتداء سے ہی ٹھیک کیا جائے تاکہ وہ ایک نیک' عادل ' رعیت پسند اور خدا ترس حکمران بن سکیں۔ چنانچہ نظام الملک کی سیاست نامہ 'اور قابوس کا قابوس نامہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

لہٰذا ہماری پوری تاریخ میں لوگوں کی قسمت کے مالک حکمران و بادشاہ رہے۔ اور رعیت کی خوش قسمتی یا بدقسمتی کا دارومدار اچھے یا برے حکمران پر رہا کیونکہ کسی ایسے مضبوط ادارے کا وجود نہیں تھا کہ جو خراب اور بداعمال حکمران سے لوگوں کو نجات دلائے' اس لئے اکثر لوگ یہی دعا مانگتے تھے کہ موت کے ذریعہ اس سے چھٹکارا پایا

جائے۔ چنانچہ آخری دور مغلیہ میں جب کہ ایک کے بعد ایک خراب عیاش اور بدعنوان حکمران آئے لوگ یہی دعا مانگتے رہے اور امید کرتے رہے کہ ایک کے مرنے کے بعد دوسر شاید بہتر ہو' مگر ایسا کوئی معجزہ ظاہر نہیں ہوا اور حکومت و رعیت ان نکمے اور نالائق حکمرانوں کی وجہ سے مصیبتوں میں مبتلا رہی۔

ہندوستان کی تاریخ کے تسلسل میں تھوڑا سا وقفہ بھی آیا' جب یہاں انگریزوں نے اپنے اقتدار کو قائم کرلیا۔ مگر ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان میں پھر انہیں روایات کو اختیار کیا گیا اور ہمارے راہنماؤں نے انفرادی مفادات کے تحت اس کو بہتر سمجھا کہ اپنی مطلق العنانیت کو قائم کریں اور ان پر جن اداروں کا ذرا بھی دباؤ ہے انہیں ختم کردیں یہی وجہ تھی کہ ہمارے ہاں اسمبلیاں ٹوٹتی رہیں اور آمریت قائم ہوتی رہی' ان فوجی آمروں کے دور حکومت میں تمام جمہوری اداروں کو یا تو ختم کردیا گیا یا انہیں بہت کمزور کردیا گیا' یہاں تک کہ جب تھوڑے تھوڑے وقفہ میں جمہوری حکومتیں بھی قائم ہوئیں تو ان میں بھی افراد نے یہ کوشش کی کہ وہ آمرانہ طریقوں سے حکومت کریں۔

اس کے جو نتائج نکلے وہ ہمارے سامنے ہیں کیونکہ ریاستی اداروں نے ہر بار خود کو شخصی حکمران اور آمر کی خواہشات و ارادوں کو پورا کرنے کی ذمہ داری ٹھہرا لی۔ اگر انتخاب ہوں تو کس طرح سے حکمران جماعت کو کامیاب کرایا جائے۔ بیوروکریسی اور دوسرے ادارے صاحب اقتدار افراد کو مقبول بنانے اور عوام میں ان کی اچھی شہرت قائم کرنے کے لئے پروپیگنڈہ میں مصروف رہتے ہیں۔ ٹی وی اور ریڈیو بجائے اس کے کہ لوگوں کو دنیا کے بارے میں معلومات فراہم کریں اور انہیں بدلتے ہوئے حالات کے بارے میں بتائیں یہ صدر اور وزیراعظم کی تعریفوں میں مصروف رہتے ہیں۔ اور اس طرح تمام سیاسی' معاشی اور سماجی ادارے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کی بجائے حکمران افراد کے مفادات کے لئے استعمال ہوتے ہیں' یہ غلط استعمال خود ان کی افادیت کو ختم کردیتا ہے اور لوگوں کے دلوں میں ان کا کوئی وقار اور احترام نہیں رہتا۔ اس کا معاشرہ کو تو نقصان ہوتا ہے مگر حکمران اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور اپنی مخالفت کے تمام

دروازوں کو بند کردیتے ہیں۔

دوسرا نقصان یہ ہوتا ہے کہ جب تمام طاقت فرد کے ہاتھوں میں مرتکز ہوجاتی ہے تو لوگ اداروں کی بجائے ان سے مدد طلب کرتے ہیں۔ اور اس پورے عمل میں جمہوری روایات و قدار کمزور ہوتی ہیں اور آمریت و مطلق العنانیت کی جڑیں طاقت ور ہوجاتی ہیں۔

اس کے مقابلہ میں یورپ میں تاریخ کا عمل بالکل مختلف رہا وہاں بھی فرد اور اداروں کے درمیان' طاقت' اختیارات اور اقتدار کے لئے کشمکش ہوئی' لیکن اس پورے عمل میں وہاں اداروں نے آہستہ آہستہ اپنے اختیارات کو بڑھایااور فرد کو پیچھے دھکیلتے گئے جس کے نتیجہ میں اداروں کا وقار اور احترام بڑھتا گیا اس کی سب سے اچھی مثال انگلستان کی ہے کہ جہاں بادشاہ اور پارلیمنٹ کے درمیان اقتدار کے لئے کشمکش ہوئی کہ جس میں بادشاہ آہستہ آہستہ مجبور ہوتا گیا کہ وہ اپنے اختیارات پارلیمنٹ کے سپرد کردے یہاں تک کہ اب حکمراں محض برائے نام ہے اور تمام اختیارات پارلیمنٹ کے پاس ہیں۔

فرانسیسی انقلاب میں بھی پارلیمنٹ نے حکمران کے اختیارات کو چیلنج کیا اور امراء کے اختیارات کے خلاف آواز اٹھائی اور جب یہ محسوس کرلیا گیا کہ بادشاہ اور پارلیمنٹ دونوں ایک ساتھ نہیں چل سکتے ہیں تو بادشاہت ختم کرکے فرانس کو جمہوری بنا دیا گیا۔ اگرچہ بعد میں اس بات کی کوششیں ضرور ہوئیں کہ بادشاہت کو دوبارہ سے قائم کیا جائے۔ مگر یہ کوششیں اس لئے ناکام ہوئیں کہ جمہوری ادارے اپنی جڑ پکڑ چکے تھے اور ان کی موجودگی میں مطلق العنانیت کو ابھرنے کا موقع نہیں تھا۔

لہٰذا یورپ کی تاریخ میں سیاسی' معاشی اور سماجی ادارے افراد پر فتح یاب رہے اور ان کے کردار کو کم سے کم کردیا اس کے علاوہ جیسے جیسے یہ ادارے مضبوط ہوتے چلے گئے لوگوں کی شرکت بھی اسی طرح سے معاشرہ کے معاملات میں بڑھتی چلی گئی اور تمام بالغوں کو رائے دینے کا اختیار ملا تو عورتوں کو بھی جمہوری عمل میں حصہ لینے کا موقع

دیا گیا۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی وجہ سے افراد پر لوگوں کا انحصار ختم ہوگیا اور اب تک جو ان کو یقین تھا کہ ان کی وجہ سے ان کے مسائل حل ہوں گے' یا ان کی فیاضی و سخاوت ان کی غربت کو ختم کرے گی۔ یہ تمام باتیں ایک ایک کرکے ختم ہوگئیں اور اب انہوں نے خیرات کی بجائے اپنے حقوق کا مطالبہ کرنا شروع کردیا۔

اداروں کے مستحکم ہونے کی وجہ سے عملی طور پر ان کی افادیت بڑھ گئی اور اب ان میں اگر کوئی تبدیلی بھی آتی تھی تو صرف اس صورت میں کہ جب حالات بدلیں اور لوگوں کو ان تبدیلیوں کی ضرورت ہو۔ اب یہ افراد کی خاطر خود کو تبدیل نہیں کرتے تھے۔ اس لئے ان اداروں نے جمہوریت' حقوق انسانی' آزادی' مساوات اور آزادی تحریر و تقریر کی حمایت کی اور انہیں فروغ دیا۔

اگرچہ ایشیا و افریقہ کے بہت سے ملکوں میں کہ جہاں نو آبادیاتی نظام قائم تھا اس کے خاتمہ کے لئے انہوں نے ان جمہوری اداروں اور روایت کواختیار کیا کہ جو ان نو آبادیاتی حکومتوں نے قائم کی تھیں لیکن جیسے ہی یہ ملک آزاد ہوئے نئے سیاسی راہنماؤں نے اپنی انفرادی آمریت کو قائم کرنے کے لئے ان جمہوری اداروں اور روایات کو ختم کرنا شروع کردیا۔ اس نے ان ملکوں میں آمریتوں کو فروغ دیا اور جمہوری حکومتیں کہ جن میں عوام کی شرکت ہو خواب بن گئیں افسوس یہ ہے کہ اس عمل میں کہ جس میں فرد' اداروں کے اختیارات کو غصب کرتے ہیں اور اپنی آمریت قائم کرتے ہیں' اس کی سزا معاشرہ کو ملتی ہے کہ جس کی ترقی اور خوش حالی اس عمل سے رک جاتی ہے اور وہ ذہنی لحاظ سے پس ماندہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

انتشار: تبدیلی کی ایک علامت

سیاسی انتشار و ٹوٹ پھوٹ ' سماجی بے چینی اور اس کے ساتھ ہی معاشرے کے مستحکم اداروں کا زوال' روایات و اقدار کا ختم ہونا اور اس کے نتیجہ میں حکمران طبقوں میں بدعنوانی اور لوٹ کھسوٹ کا رجحان یہ سب اس بات کی علامات ہوتی ہیں کہ معاشرہ زوال پذیر ہو رہا ہے اور اس میں صحت مندی کے آثار ختم ہو چکے ہیں' لیکن اگر دیکھا جائے تو اسی انتشار' زوال' بے چینی اور ٹوٹ پھوٹ کے عمل میں تعمیر اور نئے دور کے جراثیم ہوتے ہیں۔ کیونکہ اس صورت حال میں کہ جب ریاست کے تمام ادارے اپنا اقتدار' اثر و رسوخ اور طاقت کھو چکے ہوتے ہیں اور جب مذہبی گروہ کمزور ہو کر بے بس ہو چکے ہوتے ہیں تو اس وقت یہ موقع ہوتا ہے کہ سیاسی و مذہبی اثرات کی بندش سے آزاد ہو کر معاشرے میں ایک ذہنی انقلاب لایا جائے اور نئے خیالات و نظریات کو فروغ دیا جائے کیونکہ اس وقت معاشرہ کا ذہن اس بات پر تیار ہوتا ہے کہ وہ نئی باتوں کو قبول کرے۔ قدیم افکار اپنی ناکامی کی وجہ سے اپنا اثر کھو چکے ہوتے ہیں اور معاشرہ تعمیر کی خواہش رکھتے ہوئے ایک نئے نظام کے لئے تیار ہوتا ہے۔

لیکن اس کا سارا دارومدار معاشرہ کے دانشوروں پر ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک اس انتشار اور بے چینی کے ماحول میں صحت مند خیالات کو فروغ دے سکتے ہیں اور معاشرے کو متاثر کر سکتے ہیں کیونکہ دوسری صورت میں یہی انتشار معاشرے کی توانائیوں کو ختم کر دیتا ہے اور اس طرح اس کی زندگی کی تمام علامتیں ایک ایک کر کے ختم ہو جاتی ہیں۔

اگرچہ یورپ کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہمیں قرون وسطی میں وہ دور ملتا ہے کہ جو ہمارے آج کے حالات سے مماثلت رکھتا ہے' مثلاً" اسپین کے بارے میں اس وقت کے ایک مورخ نے جو کہا تھا کہ وہ کم و بیش آج ہمارے حالات پر صادق آتا ہے اس کا کہنا ہے کہ "اسپین کے شہروں میں چوروں' ڈاکوؤں ' ظالموں اور بدمعاشوں کا زور زورہ ہے کہ جنہوں نے ہر قسم کے جرائم سے ان شہروں کی زندگی اجیرن کردی ہے ان میں سے اکثر وہ ہیں کہ جو ریاستی اور الٰہی قوانین کی کوئی پرواہ نہیں کرتے ہیں اور انصاف کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے کچھ ایسے ہیں کہ جنہوں نے عیاشی کو اپنا وطیرہ بنا لیا ہے اور بے شرمی سے دوسروں کی بیویوں ' بہنوں اور دوشیزاؤں کی بے حرمتی کرتے ہیں کچھ وہ ہیں کہ جو تاجروں اور مسافروں کو لوٹتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں کہ جنہوں نے بادشاہ کی زمین اور اس کے قلعوں پر قبضہ کرلیا ہے اور وہاں سے حملے کرکے اپنے ہمسایوں کو لوٹتے ہیں اور انہیں پریشان کرتے ہیں۔"

جب کسی بھی ریاست میں بدامنی اور لاقانونیت بڑھتی ہے تو اس کے خاتمہ کے لئے قوانین کو سخت کیا جاتا ہے اور سزاؤں میں اضافہ کرکے پرتشدد بنایا جاتا ہے اس صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے ایک جدید مورخ نے قرون وسطی کے یورپ کے بارے میں لکھا ہے کہ اس زمانہ میں سزاؤں اور پھانسی کے منظر سے تماشائی اس طرح لطف اندوز ہوتے تھے کہ جیسا یہ کوئی تماشہ ہو (ہمارے ہاں ضیاء الحق کے زمانہ میں یہی مناظر دیکھنے میں آئے تھے)

جب معاشرہ میں انتشار ہو تو اس کے اثرات سماجی طور پر ان کے رہن سہن' ماحول اور صفائی پر ہوتے ہیں۔ جب شہروں اور گاؤں میں گندگی و غلاظت ہوگی اور صفائی کا انتظام نہ ہوگا' کھانے پینے کی چیزوں میں ملاوٹ ہوگی تو اس کے نتیجہ میں بیماریاں اور وبائیں پھیلی گیں۔ اس پہلو کی طرف نشاندہی کرتے ہوئے ایک مورخ نے لکھا ہے کہ قرون وسطی کے شہروں میں بیماریوں اور دباؤ کی وجہ سے ان کی صفائی کا ناقص انتظام تھا اور اس کی وجہ سے لوگوں کی عادات واطوار اور اخلاق بھی خراب

ہوتے تھے اور یہ صورت حال انہیں ہمیشہ جھگڑوں میں الجھا کر رکھتی تھی۔

قرون وسطی کے یورپ میں ایک طرف تو شہروں اور لوگوں کی یہ حالت تھی اور دوسری طرف حکومت اور حکمران طبقوں کی دلچسپی صرف یہ تھی کہ لوگوں سے کیسے زیادہ سے زیادہ ٹیکس لئے جائیں اور ان کی جیبوں سے پیسہ نکلوایا جائے جب کہ اس کے بدلہ میں ریاست نہ انہیں تحفظ دیتی تھی اور نہ ہی ان کی فلاح کے لئے کوئی کام کرتی تھی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریاست' مذہبی گروہ اور حکمران طبقوں کا عوام میں اثر و رسوخ ختم ہوگیا اور اس کے ساتھ ان کی عزت و احترام بھی لوگوں میں نہیں رہا' اور اب اپنے مسائل کے حل کے لئے ان کی جانب دیکھنے کی بجائے انہوں نے متبادل باتوں پر غور کرنا شروع کردیا۔ لیکن معاشرے میں تبدیلی اس وقت آئی جب کہ یورپ کے دانشوروں نے تاریخ کے اس نازک لمحہ میں معاشرے کے چیلنجوں کا موثر جواب دیا اور لوگوں کے ذہنوں کو اپنے نظریات و خیالات سے متاثر کیا' چنانچہ ریناساں کے دور میں عقلیت' انسان دوستی اور روشن خیالی کو فروغ ہوا' تو تحریک اصلاح مذہب میں چرچ اور پوپ کی طاقت کو چیلنج کیا گیا جس کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ چرچ کا اقتدار جو پورے یورپ پر چھایا ہوا تھا وہ ٹوٹا اور اس نے قومی ریاستوں کی تشکیل کے لئے راہیں ہموار کیں اور یہی جدید یورپ کی ابتداء تھی کہ جو تنزلی اور بدعنوانیوں کے ڈھیر سے ابھرا اور پھیلتا ہوا پوری دنیا پر چھا گیا۔

یہ صحیح ہے کہ ہمارا معاشرہ بھی ان ہی حالات سے دوچار ہے لیکن جو کمی ہے وہ یہ ہے کہ ان حالات کا چیلنج کرنے کے لئے کوئی موثر نظریات و افکار نہیں ہیں کہ جو خستہ اور زوال پذیر روایات کی جگہ لے سکیں اور ان کا نعم البدل فراہم کرسکیں۔ اور ہو یہ رہا ہے کہ جیسے جیسے ہمارے ادارے اور روایات کمزور ہورہی ہیں ان کی جگہ اور زیادہ قدامت پسند قدریں جگہ لے رہی ہیں اور ان حالات میں انسان دوستی ' روشن خیالی اور سیکولر ازم کے لئے انتہائی مشکل ہوگیا ہے کہ وہ اپنے لئے کوئی جگہ بناسکیں۔

دیکھا جائے تو تاریخ خود سے قوموں کی قسمت کا فیصلہ نہیں کرتی ہے' بلکہ یہ ہمارا اپنا انتخاب ہوتا ہے کہ ہم کون سا راستہ اختیار کرتے ہیں ہمارے لئے یہ انتخاب ہے کہ ہم جدیدیت کی راہ اختیار کرکے عالمی قدروں کے ساتھ اپنا ملاپ کریں اور یہ بھی اختیار ہے کہ اسے رد کرکے اپنی قدامت پرستی کیساتھ چمٹے رہیں اور اپنی مکمل تباہی کا انتظار کریں۔

سیاست اور سماجی اصلاحات

ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے قائم ہونے کے بعد' ہندوستان کے کچھ اہل علم اور دانشوروں نے اس کا تجزیہ کیا کہ کیوں انگریزوں نے اتنی آسانی سے اور موثر انداز میں اپنی اقتدار کو قائم کرلیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ دوسرے سماجی ' سیاسی اور معاشی وجوہات کے علاوہ انگریزوں کی کامیابی بنیادی طور پر ان کی سائنسی ترقی کی وجہ سے ممکن ہوئی اور ان کی شکست کی وجہ یہ تھی کہ ان کے ادارے' اقدار اور روایات فرسودہ ہوچکے تھے اور زمانہ کی ترقی سے بہت پیچھے رہ گئے تھے اور ان میں توانائی باقی نہیں رہی تھی کہ بدلتے ہوئے حالات کا مقابلہ کرسکتے۔

چنانچہ اپنی اس شکست سے سبق سیکھتے ہوئے ' ان دانشوروں نے اس بات کی کوشش کی کہ وہ اپنے معاشرہ کی اصلاح کریں اور اس میں جو خرابیاں جڑ پکڑ چکی ہیں انہیں دور کریں کیونکہ انہیں اس کا بخوبی اندازہ تھا کہ اس کے بغیر وہ نہ تو ترقی کرسکتے ہیں اور نہ ہی غلامی سے چھٹکارا پاسکتے ہیں۔

راجہ رام موہن رائے کی برہمو سماج اس قسم کی ایک تحریک تھی کہ جس کے ذریعہ اس بات کی کوشش کی گئی کہ ان ہندو رسوم و رواج کو ختم کیا جائے کہ جن کی وجہ سے ہندو معاشرہ پسماندگی میں ہے۔ یہ ضرور ہوا کہ اس تحریک اور اصلاحات کی تبلیغ کی وجہ سے قدامت پرست' طبقے سخت ناراض ہوئے اور انہوں نے مذہب کے نام پر ان اصلاحات کی سخت مخالفت کی مگر اس تحریک نے نوجوانوں کو خاص طور سے متاثر کیا اور انہوں نے تحریک میں عملی حصہ لے کر اسے نہ صرف بنگال میں مقبول بنایا بلکہ

اس کے اثرات کو ہندوستان کے دوسرے حصوں تک بھی پہنچایا۔

اس قسم کی تحریکیں مسلمانوں میں سر سید احمد خان نے شروع کی' اور مسلمانوں کے طبقہ اشراف میں انگریزی تعلیم کا شوق دلا کر اس بات کی کوشش کی کہ وہ ان کے ذہنوں سے تنگ نظری اور مذہبی تعصب کو ختم کریں اور انہیں اس قابل بنائیں کہ وہ بدلتے ہوئے حالات میں خود کو زندہ رکھ سکیں۔

ان ابتدائی مصلحین نے سماجی اصلاحات کی تحریک چلائی اور سیاست میں قطعی حصہ نہیں لیا اس کی وجہ یہ تھی کہ انہیں اس بات کا اندازہ تھا کہ فوجی لحاظ سے ہندوستانی بہت کمزور ہیں اور انگریزوں کا مقابلہ نہیں کرسکتے ۔ اس لئے انہوں نے ان میں سیاسی جذبات بیدار کرنے کی بجائے ابتدائی طور پر انہیں سماجی طور پر بہتر بنانا ضروری سمجھا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اولین طور پر اہل ہندوستان جدید اقدار اور روایات سے روشناس ہوں تاکہ وہ یورپی تہذیب اور یورپی ذہن کو سمجھ سکیں اور یہ سمجھ میں آنے والی بات تھی کہ انگریزوں کا سیاسی طور پر مقابلہ کرنے کے لئے ضروری تھا کہ پہلے سماجی طور پر خود کو منظم کیا جائے۔

چنانچہ ہوا یہ کہ ۱۸۸۵ء میں جب کانگریس قائم ہوئی تو اس کے ساتھ ہی سماجی اصلاحات کا پروگرام کمزور ہوگیا اور اب جو سیاسی لیڈر شپ ابھری اس کا مقصد سماجی سے زیادہ سیاسی اصلاحات اور سیاسی مسائل تھے' اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سماجی پروگرام ختم ہونے کے نتیجہ میں ہندوستانی معاشرہ دو طبقوں میں تقسیم ہوگیا: یورپی تعلیم یافتہ جو کہ اقلیت میں تھے اور جاہل و غریب عوام جن کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اپنی کامیابی کے لئے اس اقلیت نے اکثریت کے جذبات کو ابھارا تاکہ ان کی مدد سے وہ اپنے سیاسی مقاصد کو حاصل کرسکیں۔

چنانچہ سیاسی اور مذہبی مسائل ' سماجی اصلاحات کے مقابلہ میں زیادہ اہمیت اختیار کرگئے ' ان میں سے چند اہم مسائل جنھوں نے ہندوستان کی سیاست پر گہرا اثر ڈالا وہ خلافت کے تحفظ کے لئے چلائی جانے والی تحریک اور مسجد کانپور یا مسجد شہید گنج کے

واقعات تھے۔

ملک کی تقسیم کے بعد بھی ہماری سیاسی جماعتوں نے سماجی اصلاحات یا عوامی فلاح و بہبود کے کاموں میں کوئی دلچسپی نہیں لی اور اپنی ساری توجہ سیاسی و مذہبی امور پر رکھی تاکہ ان کے ذریعہ لوگوں کی حمایت حاصل کی جائے اور ہوا یہ کہ جیسے جیسے سیاسی جماعتوں کی تعداد بڑھتی گئی اسی حساب سے سیاسی مسائل کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہا اور انہیں بنیادوں پر لوگوں کو سیاسی جماعتوں نے اپنے مفادات پر قربان کیا۔ آپس میں مقابلہ کی وجہ سے ایک ہی قسم کے سیاسی مطالبات و مسائل کی وجہ سے یہ جماعتیں دن بدن تنگ نظر اور پر تشدد ہوتی چلی گئیں اور اب ان سیاسی جماعتوں کا محض کام یہ ہے کہ لوگوں کے مجمع کو اکٹھا کیا جائے اور ان کے سامنے لمبی لمبی تقریریں کرکے انہیں نصیحتیں کی جائیں اور انہیں قربانی کے لئے کہا جائے۔

یہ سیاسی جماعتیں چونکہ کسی قسم کا سماجی پروگرام نہیں رکھتی ہیں اس لئے انہیں لوگوں کے مسائل اور ان کی مصیبتوں و تکلیفوں کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہوتا ہے ان کا لوگوں سے واسطہ صرف اتنا ہوتا ہے کہ جتنا اسٹیج اور مجمع کا' وہ صرف تقریروں کے ذریعہ مجمع کو اپنی باتیں سناتے ہیں مگر مجمع کی باتیں سننے کے لئے ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں اس وجہ سے سیاسی جماعتیں اور لوگ کٹے ہوئے ہیں۔ ان کے درمیان وسیع فاصلے ہیں۔ اس لئے اگر سیاسی جماعتوں کو لوگوں سے تعلق پیدا کرنا ہے تو ضروری ہے کہ وہ سیاسی اصلاحات کو اپنے پروگرام میں شامل کریں۔ کیونکہ اس کے بعد ہی وہ لوگوں کے اندر جاکر ان میں کام کرکے انہیں بہتر طریقے سے سمجھ سکیں گے اور اس طرح ان کے درمیانی فاصلے کم ہوجائیں گے۔

پانچ سو سال بعد

اب تک کولمبس کی یاد کو ہر سال امریکہ میں بغیر کسی تنقید کے منایا جاتا رہا' اور اسے امریکہ کی دریافت پر ایک ہیرو کا درجہ دے دیا گیا لیکن جب اکتوبر ۱۹۹۲ء میں اس کی دریافت کے ۵ سو سال پورا ہونے پر امریکہ میں ایک بڑے جشن کا پروگرام بنایا گیا تو اس پر مورخوں' سیاست دانوں اور دانشوروں نے زبردست احتجاج کیا اور اس احتجاج کی وجہ اب وہ تحقیق ہے' کہ جو امریکہ کے دریافت ہونے کے بارے میں ہوئی ہے اور وہ سیاسی و ذہنی شعور ہے' کہ امریکہ کے قدیم باشندوں میں ہوا' اور ان کا ساتھ دینے والے روشن خیال دانشور تھے کہ جنہوں نے تاریخ کے یورپی نقطہ نظر سے انحراف کرتے ہوئے' امریکہ کی دریافت کو امریکہ کے قدیم باشندون کے نقطہ نظر سے دیکھا اور سمجھا۔ انہوں نے کولمبس کی دریافت کے نتیجہ میں ان پر جو جو مظالم ہوئے' جس بربریت اور درندگی سے انہیں تباہ و برباد کیا گیا' اس کے بارے میں حقائق کو بے نقاب کرکے' اس بات کی کوشش کی کہ کولمبس کو جو ہیرو کا درجہ دے دیا گیا ہے وہ اس سے چھینا جائے۔ اور اسے ایک عام مجرم کی حیثیت سے دیکھا جائے کہ جو امریکہ کی قدیم تہذیب کو تباہ کرنے کا ذمہ دار ہے۔

اس سلسلہ میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں' وہ کتابیں بھی کہ جن میں کولمبس کو بطور ہیرو پیش کیا گیا ہے۔ لیکن ایسی بھی کتابیں چھپیں کہ جنہوں نے تاریخ کے اس نقطہ نظر کو رد کرکے کولمبس کی دریافت کے بعد جو اثرات نئی دنیا پر ہوئے ان پر روشنی ڈالی ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ اس دریافت نے امریکہ کے ماحول' ثقافت اور لوگوں کو

تباہ کردیا ان ہی کتابوں میں سے ایک کتاب کرک پیٹرک سیل کی ہے جس کا عنوان ہے "جنت کی فتح"

اس میں سب سے پہلے تو مصنف نے اس مفروضہ کو رد کیا ہے کہ امریکہ کولمبس کی دریافت تھی' اس نے یہ ثابت کیا کہ کولمبس سے بہت پہلے اسے ناروے والوں نے دریافت کیا تھا' جن میں مشہور لائف راک سن اور بجورنی ہرجولف سن تھے کہ جنہوں نے اپنے بحری سفروں کے دوران نئی دنیا کے کچھ جزیروں کو پایا تھا اور اس دریافت کے حقدار یہی نہیں اور بھی بہت سے ہیں۔ مگر کولمبس کو اس وجہ سے فوقیت ملی کہ ایک تو اس نے اپنے سفر اور دریافت کو باقاعدہ سے تحریری طور پر محفوظ کرلیا اور دوسرے یہ ہوا کہ یورپ اور امریکہ کے درمیان ایک راستہ متعین ہوگیا کہ جس پر آگے چل کر دوسری مہمات آتی جاتی رہیں۔ اس کے علاوہ کولمبس کی دریافت چھاپہ خانہ کی وجہ سے چھپ کر خوب پھیلی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی دریافت کے پس منظر میں نئی دنیا کو فتح کرنا اور اس کو اپنی نو آبادیات بنا کر اس کے ذرائع کو لوٹنا تھا۔

دراصل کولمبس کا مقصد امریکہ کی زمین پر قبضہ کرنا تھا اسے وہاں کے لوگوں یا ان کی تہذیب و ثقافت سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے جیسے ہی وہ امریکہ کی سرزمین پر اترا اس نے پہلا کام یہ کیا کہ زمین پر جھنڈا گاڑ کر اس پر اپنے قبضہ کا اعلان کیا۔ دوسرا کام اس نے یہ کیا کہ اس نے اس جگہ کو ایک نیا نام دیا۔ یہ یقین کرتے ہوئے کہ نہ تو اس جگہ کا پہلے سے کوئی نام ہے اور نہ ہی وہاں کے رہنے والوں کی کوئی شناخت ہے۔ اس نے جیسے ہی وہاں کے پرامن اور سادہ لوگوں کو دیکھا تو اس کے تاثرات یہ تھے کہ ان لوگوں کے پاس نہ تو کوئی ہتھیار ہیں اور نہ ہی یہ ان سے واقف ہیں۔ لہٰذا ایسے لوگوں کو جو نہ تو مسلح ہوں اور نہ جنگ اور لڑنے سے واقف ہوں' ایسے لوگوں پر قابو پانا اور انہیں غلام بنا کر اپنے مقصد کے لئے استعمال کرنا بڑا آسان تھا۔ اسلئے سیل کا کہنا تھا کہ کولمبس کے ان تاثرات کے ساتھ ہی امریکہ میں غلامی کی ابتدائی ہوگئی۔

جب سے دنیا میں قوموں کو غلام بنانے کا سلسلہ شروع ہوا ہے فاتح اقوام اپنے اس

اقدام کو اخلاقی جواز دینے کے لئے سب سے پہلے یہ کام کرتی ہیں کہ کمزور اور مفتوح اقوام کو انسانیت کے درجہ سے گراتی ہیں اور انہیں وحشی' غیر مہذب اور جاہل قرار دیتی ہیں تاکہ اس کے بعد ان کے ساتھ جو بھی سلوک کیا جائے وہ جائز قرار پائے۔ اس چیز کو ذہن میں رکھتے ہوئے گیری ناش نے جو کہ ایک مشہور امریکی مورخ ہے۔ کہا ہے کہ انسانیت سے گرانے کے بعد انہیں قید کرنا اور سزائیں دینا یا انہیں قتل کرنا اور تباہ و برباد کرنا یہ سب جائز ہو جاتا ہے۔

اور امریکہ کی تاریخ میں ہوا بھی یہی کہ امریکی باشندوں کو غلام بنایا گیا' اذیتیں دی گئیں اور مجبور کیا گیا کہ وہ انہیں سونا دیں۔ اگر انہوں نے ان کے مطالبات کو پورا نہیں کیا اور ان کو سونا فراہم نہیں کیا تو انتقاماً" ان کا قتل عام کیا گیا جس کی وجہ سے جزیرے کے جزیرے غیر آباد ہو گئے۔

اور پھر قدیم باشندوں کی تباہی ہتھیاروں کے ذریعہ نہیں آئی بلکہ یورپی بیماریوں جن میں خسرہ ' چیچک ' ٹی بی اور ٹائی فس تھیں انہوں نے ان کا صفایا کر دیا جیسے جیسے یہ قدیم باشندے مرتے رہے' قتل ہوتے رہے اسی طرح سے ان کی زمینوں پر یورپی آباد ہوتے رہے۔

ان یورپی لوگوں نے قدیم باشندوں کے شہروں' دیہاتوں اور گاؤں ہی کو تباہ و برباد نہیں کیا بلکہ ان کے ماحول کو بھی خراب کر دیا اور ان کے اور فطرت کے درمیان جو رشتہ اور ہم آہنگی تھی اسے نئی فصلوں اور جانوروں کے استعمال سے بگاڑ دیا۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ کیوں ایک خطہ کے لوگوں اور ان کے کلچر کو تباہ و برباد کر دیا گیا۔ اس کی تہہ میں مغربی تہذیب کی جارحیت ہے جو فطرت کے خلاف ہے۔ اسی لئے ہم نے اس ہم آہنگی کو برقرار رکھنے کی بجائے اسے خراب کیا اور اس پر قابو پا کر اسے اپنے مفادات میں استعمال کیا جبکہ ان کے مقابلہ میں قدیم باشندوں کا فطرت سے رشتہ اور تعلق تھا اور وہ اس کے ساتھ امن اور مفاہمت کے ساتھ رہ رہے تھے لہٰذا جب فطرت کو تباہ کیا گیا تو اس کا اثر قدیم باشندوں

کی زندگی پر پڑا اور ماحول کی تبدیلی نے انہیں مزید ختم کرنے میں مدد دی اور اس سے ان کی آبادی اور کم ہو گئی۔

یہ بات صاف ظاہر ہے کہ یورپ کے لوگوں کو صرف زمین سے دلچسپی تھی اور لوگوں کی انہیں کوئی پرواہ نہیں تھی اس لئے انہوں نے زمین کو ' باغ عدن اور ارضی جنت کہا اور جب زمین اس قدر خوبصورت ہو تو مہذب لوگوں کا یہ فرض ہو جاتا ہے کہ اسے جاہلوں وحشیوں اور گندے لوگوں سے پاک کیا جائے اور اس فریضہ کو یورپیوں نے بخوبی سرانجام دیا۔

اس لئے ان حقائق کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب کولمبس کی دریافت کو معجزہ قرار دیا جائے اس کی تعریف و توصیف کی جائے اور اسے ایک شاندار کارنامہ بتایا جائے تو یہ امریکی انڈین کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف ہے اب تو ضرورت اس بات کی ہے کہ جو کچھ یورپیوں نے مقامی باشندون کے ساتھ کیا ہے ان جرائم کا اعتراف کیا جائے اور ان کے ازالہ کا سوچا جائے۔

ایک طرف اسپین کی سرپرستی میں نئی دنیا کی دریافت ہو رہی تھی تو دوسری طرف اسی زمانے میں اندلس سے مسلمانوں کی آخری سلطنت غرناطہ کا خاتمہ ہوا تھا جس کے بعد سے مسلمانوں کے لئے وہاں رہنے کا ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ اپنا مذہب چھوڑ کر عیسائیت اختیار کریں تاریخ کے اس نازک مرحلہ پر مسلمان امراء نے تو اپنے گھروں کو تالے لگا کر اور چابیاں لے کر شمالی افریقہ ہجرت کی کہ جب حالات بہتر ہو جائیں گے تو دوبارہ اپنے گھروں کے تالے کھول کر واپس آجائیں گے۔ مگر یہ وقت ان کے لئے پھر کبھی نہیں آیا ان کے گھروں کے تالے کھل گئے اگرچہ یہ چابیاں ان کے خاندانوں میں برسوں بطور یادگار رہیں۔ اس کے بعد جو غریب بچے انہوں نے ایک عرصہ تک تو اپنے مذہب کو خفیہ طور پر باقی رکھا اور مگر آہستہ آہستہ عیسائی معاشرے میں ضم ہوتے گئے۔ تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی یادگاریں تو اندلس میں باقی رہ گئیں مگر وہ خود باقی نہیں رہے۔

طارق بن زیاد کے ہاتھوں ۷۱۱ء میں اندلس کی فتح شاید تاریخ کا اتنا بڑا واقعہ نہیں بنتی' اگر عرب اس فتح کے بعد اندلس میں ایک ایسے معاشرے کی بنیاد نہیں ڈالتے جو مذہبی رواداری' علمی ترقی اور معاشی خوشحالی کی وجہ سے مشہور نہ ہوا ہوتا۔ عربوں کی فتح نے اندلس کی ٹھہری ہوئی زندگی میں ایک طوفان برپا کردیا اور وہ معاشرہ جو اپنے مذہبی تنگ نظری' کم علمی اور زراعتی پیداوار میں انتہائی پس ماندہ تھا وہ نئے آنے والوں کی وجہ سے ایک نئے دور سے روشناس ہوا اور عربوں نے جو تجربات عراق' شام' ایران اور شمالی افریقہ سے حاصل کئے تھے ان کے استعمال نے اندلس کی سماجی و معاشی زندگی کو بدل ڈالا۔

عربوں کی فتح کے فوراً" بعد ہی ایک ایسے معاشرے کی بنیاد پڑنی شروع ہوئی کہ جس میں ہر مذہب و عقیدے کے لوگوں کو ہم آہنگ کرلیا گیا وہ عیسائی جنھوں نے عربی کلچر اختیار کیا وہ مضاربہ کہلائے اور عربی معاشرہ میں مل گئے۔ یہودی جو اب تک ظلم و ستم کا شکار تھے وہ تجارت اور سفارت میں ممتاز ہوئے۔ لوگوں کو آپس میں ملانے کا ذریعہ عربی زبان ہوئی جو بہت جلد سب کی زبان بن گئی۔

رواداری اور ثقافتی ہم آہنگی پیدا کرنے میں معاشی خوش حالی کو بڑا دخل تھا۔ عربوں نے آبپاشی کے ان تجربات سے جو انہیں دمشق اور یمن میں ہوئے تھے کہ جن میں ہر کاشت کار کو یا تو مقررہ پانی ملتا تھا' یا اس کے لئے پانی حاصل کرنے کا وقت مقرر تھا' اس کی وجہ سے زراعت کو فروغ ہوا اور نئی نئی فصلیں کاشت ہونا شروع ہوئیں' جن میں بادام' چیری' انار' انجیر' کھجور' گنا' کیلے' زعفران' دھنیہ' چنا' کپاس اور خوشبو دار مسالوں کی جڑی بوٹیاں اہم تھیں کہ جن کی وجہ سے کھانوں کی اقسام کا رواج ہوا اور اہل یورپ نئے ذائقوں سے روشناس ہوئے۔ اندلس کی تجارت میں اس وقت ترقی ہوئی کہ جب بازنطینی بحری طاقت کا خاتمہ ہوا اور اشبیلہ و قرطبہ مشہور تجارتی شہر بن گئے۔

زراعتی و تجارتی خوش حالی کی وجہ سے اندلس کے شہر میں طیلطلہ' ملیبیہ' قرطبہ

' اشبیلہ اور غرناطہ شامل تھے یہ اپنے باغات ' مساجد ' مدرسوں' حماموں 'کتب خانوں اور محلات کی وجہ سے مشہور ہوگئے۔ آج بھی مسجد قرطبہ' مدینہ الزہرا اور الحمراء کے رومانوی نقوش ہمارے ذہنوں میں موجود ہیں۔

اور ایک ایسا معاشرہ کہ جو روشن خیال اور روادار ہو وہیں پر فلسفہ' و ادب اور فن آزادی کی فضاؤں میں ترقی کرتے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ ابن ارشد وفات ۱۲۹۸ جیسا فلسفی پیدا ہوا کہ جس نے عقلیت پرستی کا پرچار کیا اور ابن العربی کو یہ فضا ملی کہ انہوں نے وحدت الوجود کے نظریہ کو فروغ دیا۔

اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسا معاشرہ کہ جس کی بنیاد رواداری اور روشن خیالی پر ہو وہ آخر کیوں ان طاقتوں کے ہاتھوں شکست کھا گیا کہ جو تنگ نظر متعصب اور پس ماندہ تھیں؟

اس سوال کا جواب اس لئے پیچیدہ ہے کہ تاریخ کے پاس ایسے کوئی قوانین نہیں ہیں کہ جن کی روشنی میں ایک جواب دیا جاسکے۔ لیکن تاریخ اس عمل کی نشان دہی ضرور کرسکتی ہے کہ جو اس معاشرہ کو زوال کی جانب لے گئے۔

مسلمانوں اور عیسائیوں میں مخالفانہ کشمکش اس وقت سے جاری تھی کہ جب انہوں نے اندلس کو فتح کرکے کئی عیسائی ریاستوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرلیا تھا مگر شمال میں عیسائیوں کی ایسی ریاستیں باقی تھیں کہ جو فتح نہیں ہوسکیں تھیں' اور وہ خراج دے کر اپنے وجود کو برقرار رکھے ہوئے تھیں۔ اندلس کی ریاست میں اس وقت استحکام آیا جب ۷۵۰ میں امیہ خاندان نے یہاں پر اپنی حکومت قائم کی اور اپنا تعلق مشرقی خلافت سے ختم کرلیا۔ ان کی مسلسل فتوحات نے قوت و طاقت اور دولت میں اضافہ کیا۔ مگر شخصی حکومتیں اس وقت تک مضبوط رہتی ہیں جب تک باصلاحیت افراد اقتدار میں آتے رہتے ہیں' لیکن جب صلاحیت کی بجائے محض خاندان کے نام کے سہارے نالائق افراد اقتدار حاصل کرتے ہیں تو وہ ریاست کے اداروں کو کمزور کرکے سیاسی طاقت کو زوال پذیر کردیتے ہیں امیہ خاندان کی کمزوری سے اول تو عامری خاندان نے اپنی

آمریت قائم کر کے فائدہ اٹھایا مگر جب یہ بھی سلطنت کے دفاع کے قابل نہیں رہے تو سلطنت ٹوٹ پھوٹ کے ۳۰ چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہو گئی۔

اس کمزوری سے مشرق کے عیسائی ریاستوں نے فائدہ اٹھایا اور ۱۰۸۵ میں طلیطلہ ۱۲۳۶ میں قرطبہ اور ۱۲۴۸ء میں اشبیلیہ عیسائیوں کے ہاتھوں میں چلے گئے۔ اس عرصہ میں اگرچہ اس بات کی کوشش کی گئی کہ مشرقی افریقہ میں غیر ملکی امداد کے ذریعہ اس زوال کو روکا جائے اور المرابطون، الموحدون کے خاندانوں نے یہ امداد بھی فراہم کی مگر یہ امداد اندرونی کمزوریوں کا کوئی علاج نہیں کرسکی۔ طوائف الملوکی کے اس عہد میں شمال کی عیسائی ریاستوں کے حملوں میں شدت آگئی ان ریاستوں نے اول تو اپنے بچاؤ کے لئے ان سے معاہدے کر کے انہیں خراج دینا شروع کردیا۔ مگر تیرھویں صدی میں ان کا خاتمہ ہونا شروع ہوگیا۔ عیسائی ریاستوں نے جیسے جیسے ان ریاستوں پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ انہوں نے وہاں عیسائی آبادیاں قائم کرنی شروع کردیں (جیسا کہ اسرائیل بھی کر رہا ہے) اس کی وجہ سے عیسائیوں کا غلبہ بڑھتا رہا۔ اگرچہ اس دوران مسلمانوں کو یہ آزادی تھی کہ وہ اپنا مذہب باقی رکھ سکتے تھے مگر وقت کے دباؤ کے ساتھ ساتھ یہ مسلمان عیسائی معاشرہ میں ملتے گئے اور اپنی شناخت ختم کرتے گئے۔

مسلمانوں کی آخری ریاست غرناطہ کو ۱۴۹۲ میں قسطنطیہ اور اراغوان کی ریاستوں نے مل کر شکست دی۔ سیاست و اقتدار کے اس خاتمہ کے بعد اندلس میں رہنے والے مسلمانوں کے لئے اب کئی سوالات پیدا ہوئے۔ پہلا سوال تو یہ تھا کہ مسلمانوں کی حکومت کے خاتمہ کے بعد اندلس دارالحرب میں تبدیل ہوگیا تھا اس لئے کیا ہجرت کی جائے یا جہاد کے ذریعہ اسے دوبارہ دارالسلام میں بدلا جائے؟ اسپین کے ایک عالم کا فتویٰ تھا کہ مسلمانوں کو اندلس چھوڑ دینا چاہئے کیونکہ عیسائی حکومت روادار ہے اور ان کے لئے ہجرت ضروری ہے کیونکہ اس صورت میں مذہب کو چھوڑنے کے امکانات بڑھ جائیں گے۔

اس لئے مسلمانوں نے دونوں باتوں پر عمل کیا اور ان میں سے صاحب ثروت و

دولت مند افراد نے ہجرت کی راہ اختیار کی اور وہ مشرقی افریقہ میں جاکر آباد ہوگئے۔ کچھ جماعتوں اور گروہوں نے مزاحمت کا راستہ اختیار کیا اور ایک طویل عرصہ تک وہ عیسائی ریاست کے خلاف لڑتے رہے یہاں تک کہ انہوں نے تھوڑے وقت کے لئے غرناطہ پر بھی قبضہ کرلیا۔ مگر ۱۵۶۸ میں ال پچارا میں ان کی مزاحمت کا خاتمہ ہوگیا۔

مسلمانوں کو وہ اکثریت جو نہ تو ہجرت کرسکی اور نہ مزاحمت میں شریک ہوسکی وہ بغیر راہنما اور صاحب اقتدار لوگوں کے بے سہارا ہوگئے۔ ان لوگوں نے ایک عرصہ تک اپنے مذہب اور شناخت کو قائم رکھنے کی کوشش کی۔ ان میں کچھ ظاہری طور پر عیسائی ہوگئے اور خفیہ طور پر مسلمان رہے۔ مگر ان کے لئے انکوئزیشن کے محکمہ کے مظالم اور سزاؤں کے سامنے یہ ممکن نہیں رہا۔ عیسائی ریاست نے اندلس کے معاشرہ کو عربی کلچر سے پاک کرنے کے لئے عربی کتابوں کو جلا دیا۔ مسجدوں کو گرجاؤں میں تبدیل کیا' حماموں کو ڈھا دیا اور عربی زبان و لباس کو ممنوع قرار دیا گیا۔

۱۵۰۱ء میں غرناطہ کے مسلمانوں سے کہا گیا کہ یا تو عیسائی ہوجائیں یا ملک چھوڑدیں۔ شاید اس حکم پر پوری طرح سے عمل نہیں ہوسکا اس لئے اس کے بعد ۱۵۲۶ء ۱۵۵۶ اور آخر کار ۱۶۱۹ میں اندلس نے تمام مسلمانوں کو نکال دیا گیا۔

اندلس سے اگرچہ مسلمانوں کو نکال دیا گیا اور ان کے نشانات کو مٹانے کی کوشش کی گئیں مگر ان کے اثرات جو ذہنوں پر ہوئے تھے اور جو آثار باقی رہ گئے تھے انہوں نے یورپ کی ذہنی ترقی میں حصہ لیا عربی کتابوں کے لاطینی ترجموں نے یورپ کی سائنسی و علمی ترقی کی بنیاد ڈالی۔

اسپین نے خود اس سرمایہ سے اپنی مذہبی تنگ نظری کی وجہ سے فائدہ نہیں اٹھایا اس لئے یہ ترقی کے بجائے پس ماندہ ہوتا چلا گیا۔ اس کا اندازہ ایک عثمانی سفیر کی رپورٹ سے ہوتا ہے جو اس نے ۱۷۸۷ء میں لکھی تھی کہ اسپین کی زراعت تباہ ہوچکی ہے اس کی آبادی کم ہے اور یہ اپنی غذائی ضروریات کے لئے مراکش کا محتاج ہے' جو سونے اور چاندی کی قیمت کے عوض اسے کھانے کا سامان فراہم کرتا ہے اس

لئے یہ امریکہ کی کانوں سے جو سونا چاندی حاصل کرتے ہیں اس کا بڑا حصہ غذائی ضروریات پوری کرنے پر صرف ہوجاتا ہے۔

اگرچہ اندلس سے ہجرت کرنے والے شمالی افریقہ اور ترکی میں آباد ہوئے اور یہاں بھی انہوں نے اپنے تجربات و علم سے ان معاشروں کو فائدہ پہنچایا۔ مثلاً" ترکی میں جو یہودی آباد ہوئے انہوں نے سب سے پہلے چھاپہ خانہ قائم کیا۔ مگر عثمان ریاست نے اس پر یہ پابندی لگائی تھی کہ وہ عربی اور ترکی زبانوں میں کوئی کتاب شائع نہیں کریں گے۔

اسپین کے عروج کی تاریخ تو آج بھی ہمارے لئے باعث فخر ہے۔ طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر ہمارے ہیروز ہیں۔ مگر اس کے زوال کو اندوھناک تاریخ سے ہم ناواقف ہیں زوال کا وہ عہد کہ جس میں مسلمانوں کا اسپین کی سرزمین سے صفایا ہوا ہمارے لئے اس لئے زیادہ ضروری ہے کہ آج مسلمانوں کے بہت سے ممالک اس سے دوچار ہیں۔

○

شہر اور دیہات

مسلمانوں کی ابتدائی تاریخ میں تہذیب و تمدن اور ثقافتی ترقی کو تین ادوار میں تقسیم کیا جاسکتا ہے' اس کے پہلے دور میں جب عرب سے باہر کے علاقوں میں فتوحات ہوئیں تو فوجیوں کی رہائش کے لئے علیحدہ شہر بسائے گئے جو کہ بنیادی طور پر قبائلی اور فوجی آبادی پر مشتمل رہے۔ اور انہوں نے ثقافتی اور سماجی طور پر شہر کی روح کو نہیں بدلا اس کی ایک مثال کوفہ کا شہر ہے کہ جو ابتداء میں فوجیوں کی رہائش کے لئے بنایا گیا تھا اور اسی وجہ سے ان کی زندگی بے روح رہی' اور یہی وجہ تھی کہ جب مسلمانوں نے سیاسی طاقت کو اور زیادہ مضبوط کیا تو ان کے لئے اس شہر میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی اور بہت جلد اس نے اپنی اہمیت کھو دی۔

دوسرا دور اس وقت شروع ہوتا ہے کہ جب مسلمانوں نے اپنی سیاسی طاقت کو مضبوط کرلیا اور ان کے خلاف مزاحمت کی تمام تحریکیں ختم ہوگئیں تو انہوں نے باز نطینی اور ایرانی سلطنتوں کے مشہور شہروں پر قبضہ کرلیا اور اپنی مذہبی و سماجی ضروریات کے تحت ان شہروں کی تنظیم کی اور عمارتوں میں تبدیلیاں کیں۔

دوسرا دور اس وقت شروع ہوا جب کہ عباسیوں نے اپنی سلطنت کو قائم کیا اور پہلی مرتبہ اسلامی معاشرے میں عرب و غیر عرب کا فرق ختم ہوکر دونوں عناصر کو باہم ملایا اس لئے ان کی بڑھتی ہوئی سلطنت اور ثقافتی و سماجی ترقی کے لئے ضروری ہوا کہ وہ ایک ایسا شہر آباد کریں کہ جہاں ان کی سلطنت کی ترقی ' معاشرہ کا اتحاد' ثقافتی پھیلاؤ اور معاشی سرگرمیوں پوری طرح سے جاری رہ سکیں' یہی وجہ تھی کہ بغداد کا شہر عباسی

سلطنت کی امنگوں کا ترجمان بن گیا اور یہ ایک ایسا کاسموپولٹن شہر تھا کہ جہاں ہر قوم ' نسل ' فرقہ اور مذہب کے لوگ آکر آپس میں مل گئے۔ اور یہ اسی ملاپ کا نتیجہ تھا کہ اس شہر نے ایک ایسی ثقافت کو پیدا کیا کہ جس میں رواداری اور وسیع القلبی تھی لیکن جیسے ہی عباسی سلطنت کا زوال ہوا اس کے ساتھ ہی بغداد کی ثقافتی و سماجی اور معاشی حیثیت بھی متاثر ہوئی اور اس کے بعد سے کئی سیاسی انقلاب آئے مگر بغداد اپنی ماضی کی حیثیت کو دوبارہ سے حاصل نہیں کر سکا۔

بغداد کے زوال کے ساتھ ہی عباسی سلطنت کے مشرقی علاقوں میں نئے خودمختار خاندان سیاسی طور پر طاقت ور ہونا شروع ہوئے اور انہوں نے وسط ایشیا کے پرانے شہروں کو دوبارہ بسایا اور اہمیت دینا شروع کردیا جس کی وجہ سے وہاں دوبارہ سے ثقافتی سرگرمیاں شروع ہوگئیں اور ان ثقافتی سرگرمیوں نے قدیم ایرانی رسومات اور تہواروں کو دوبارہ سے زندہ کردیا جن کی وجہ سے ان شہروں کی شان و شوکت بڑھ گئی۔ ہندوستان میں جب ترکوں نے فتوحات کیں تو وہ اپنے ساتھ ان شہروں کی تہذیب و تمدن کو لے کر آئے۔

ہندوستان میں مسلمان حملہ آور اور فاتح شہروں میں آباد ہوئے۔ اس لئے ان کی ثقافت شہری ثقافت رہی۔ کیونکہ شہر انتظامیہ کے مرکز تھے اس لئے مسلمانوں کا حکمران طبقہ شہروں ہی میں رہتا تھا' اور شہروں میں رہتے ہوئے انہوں نے اپنے ساتھ لائے ہوئے ایرانی کلچر کو فروغ دیا' جس کی وجہ سے ہندوستان کا کلچر شہروں سے نکل کر چھوٹے قصبوں اور دیہاتوں میں چلا گیا۔ نئے حکمران طبقہ نے اپنے لئے محلات' باغات ' مساجد اور مقبرے بنائے۔ انہوں نے رقص و موسیقی کی سرپرستی کی اور شاعری کی ترقی کے لئے مشاعروں کا انعقاد شروع کیا۔ ان سرگرمیوں کی وجہ سے ہندوستان میں ایک نیا شہری کلچر پیدا ہوا' جس میں خصوصیت سے بادشاہوں اور امراء کے قائم کردہ کارخانہ جات نے بڑا حصہ لیا کہ جہاں یہ اپنی ضروریات کے لئے لباس' فرنیچر' زیورات 'ہتھیار ' خوشبوئیں اور برتن تیار کرتے تھے اور ان کی تیاری میں ایک خاص قسم کی نفاست اور

خوبصورتی کو مدنظر رکھا جاتا تھا۔

ان شہروں میں ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان میں باہر سے آنے والے مسلمان خاندانوں کا تسلط تھا کہ جن کی مادری زبان فارسی تھی اور جو مقامی آبادی سے کم سے کم تعلق رکھتے تھے زبان کی اس علیحدگی کی وجہ سے انہوں نے خود کو دیہاتی آبادیوں سے علیحدہ کرلیا اور اسی نے ان میں برتری کے احساسات کو پیدا کیا۔

شہری اور دیہاتی آبادی کے اس فرق نے سماجی اور ثقافتی طور پر دو جماعتوں کو پیدا کیا۔ دیہاتی آبادی جس میں ہندو اور مقامی مسلمان شامل تھے انہوں نے اپنے پرانے طور طریقوں اور رواجوں کو باقی رکھا اور غیر ملکی مسلمانوں کی شہری ثقافت دیہاتوں میں کم ہی اثر انداز ہوئی۔ یہی وہ فرق تھا کہ جو آگے چل کر مسلمان حکومتوں کے لئے نقصان دہ ثابت ہوا۔ کیونکہ جب مغل مرکزیت کمزور ہوئی تو دیہاتی آبادی نے ان کے خلاف بغاوت کی اور شہروں پر حملے کرکے انہیں لوٹا' جلایا اور قتل عام کیا۔ جس کی ایک مثال جاٹوں کا دہلی اور دوسرے شہروں پر حملے ہیں کہ جس میں وہ شہری آبادیوں کو تباہ و برباد کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ لہٰذا مغلوں کے زوال میں ایک اہم سبب دیہاتی آبادی کی نفرت اور ان سے علیحدگی بھی تھی۔

○

خطابات

یہ ایک قدیم دستور تھا کہ حکمران اپنے امراء اور رعیت کو ان کی خدمات اور ان کی وفاداری کے صلہ میں خطاب دیا کرتے تھے۔ ہندوستان میں یہ رسم قدیم ہندو راجاؤں سے لے کر عہد سلاطین اور مغلوں کے دور حکومت میں بھی رہی بلکہ مغلوں نے تو اسے باقاعدہ طور سے منظم کیا۔ اور اس کو کئی قسموں میں تقسیم کرکے ہر ایک کو اس کے پیشہ 'صلاحیت اور عہدہ کے حساب سے خطاب دیا۔ خطاب ملنے کے بعد خطاب پانے والوں کی ایک طرف تو خدمات کا اعتراف کیا جاتا تھا تو دوسری طرف اس سے اس کا رتبہ اپنے ہم عصروں میں بڑھ جاتا تھا اور معاشرے میں اس کی عزت و احترام میں اضافہ ہو جاتا تھا۔

چونکہ مغلوں کے ابتدائی زمانہ میں یہ خطابات صلاحیت پر دیئے جاتے تھے۔ اس لئے ان کے لئے معاشرے میں وقار تھا' لیکن جب آخری عہد مغلیہ میں یہ خطابات خوشامد اور پسندیدگی کی بنیاد پر دیئے جانے لگے تو ان کی عزت و وقار بھی معاشرہ میں باقی نہیں رہا لیکن اس کے باوجود امراء میں زیادہ سے زیادہ اور اونچے سے اونچے خطاب حاصل کرنے کا شوق رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک ایسے معاشرہ میں کہ جہاں صلاحیتوں کی کوئی قدر نہ ہو' وہاں سماجی رتبہ اور اس کی ظاہری علامتوں کے ذریعہ لوگوں کو متاثر کیا جاتا تھا اور اس میں خطاب کی بڑی اہمیت تھی۔ مرزا غالب اپنی تنگ دستی و مفلسی کے باوجود نجم الدولہ و دبیرالملک بن کر خوش ہو گئے۔

جب اہل برطانیہ نے سیاسی اقتدار سنبھالا تو انہوں نے خطاب دینے کی اس رسم

سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور اس کے ذریعہ سے لوگوں کو اپنی حکومت کے تعاون پر مائل کیا۔ اگرچہ انہوں نے مغلوں کے زمانہ کے خطابات کو ختم کردیا اور ان کی جگہ اپنے خطابات کو رواج دیا مگر ان کی حیثیت بھی جلد ہی اس وجہ سے بڑھ گئی کہ ان خطاب کی وجہ سے خطاب پانے والا یہ سمجھتا تھا کہ حکومت اس کی عزت میں اضافہ کرکے اس کی وفاداری کو تسلیم کر رہی ہے۔

ان خطابوں میں اہم خطاب خان بہادر اور رائے بہادر تھے جو برطانوی حکومت کسی علاقہ کی اہم اور باثر شخصیتوں کو دیا کرتی تھی کہ جن کے ذریعہ وہ ان علاقوں کے لوگوں پر اثر انداز ہوسکے۔ مقامی ریاستوں کے حکمرانوں کو ہزہائی نیس یا ہزاکزالیٹڈ ہائی نیس کہا جاتا تھا جو لوگ حکومت برطانیہ کے اہم خدمات سرانجام دیتے تھے انہیں نائٹ ہڈ بھی دی جاتی تھی اس کے علاوہ ادیب شاعر اور اسکالرز کو ان کی علمی و ادبی خدمات کے صلہ میں جو خطابات دیئے جاتے تھے ان میں اہم خطاب شمس العلماء کا تھا۔

حکومت برطانیہ کے ان خطابات کے خلاف رد عمل تحریک آزادی کے دوران ہوا بلکہ جب سیاسی جدوجہد اپنے عروج پر تھی تو اس وقت سیاسی جماعتوں نے ہندوستانیوں سے یہ اپیل کی تھی کہ وہ بطور احتجاج اپنے خطابات حکومت کو واپس کردیں۔ اس اپیل کے نتیجہ میں کچھ لوگوں نے اس پر عمل کیا مگر کچھ لوگوں نے خطابات کو رکھا۔ مگر اس دوران سیاسی جماعتوں اور گروہوں نے ایک دوسری روایت کی ابتداء کی اور وہ یہ تھی کہ وہ اپنے راہنماؤں اور اہم شخصیتوں کو خود خطاب دیں گے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ حکومتی خطاب کے مقابلہ میں ایک متبادل نظام قائم کیا جائے۔ اور یہ خطابات ان لوگوں کو دیئے جائیں کہ جو لوگ اس وقت برطانوی حکومت کے خلاف جدوجہد کررہے ہیں اور ان لوگوں کو کہ جن کی خدمات حکومت تسلیم نہیں کر رہی ہے۔

یہ خطابات جو عوام کی جانب سے دیئے جاتے تھے راہنماؤں کی مقبولیت اور ان کی شخصیت کے اہم صفات کو ظاہر کرتے تھے۔ دستور یہ تھا کہ اس قسم کے خطابات عوامی جلسوں میں دیئے جاتے تھے اور لوگوں کی تصدیق ان کی تالیاں بجانے' اور نعرے لگانے

سے ہوتی تھی ایک لحاظ سے ان خطابات کی اہمیت حکومت کے خطابات سے اس لئے بڑھ جاتی تھی کہ ان کی حمایت میں لوگوں کے جذبات تھے۔ یہاں بھی خاص بات یہ تھی کہ ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمانوں نے اپنے راہنماؤں کو شاندار اور عظیم خطابات دینا شروع کردیئے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اپنے راہنماؤں کو بڑے بڑے اور عظیم خطابات دے کر وہ ہندوؤں کا مقابہ کرنا چاہتے ہوں۔

یہ اہم خطابات جس اس زمانہ میں دیئے گئے تھے وہ یہ تھے۔ رئیس الاحرار ' رئیس الہند ' قائد ملت' قائد اعظم اور فخر ملت وغیرہ۔ سیاسی راہنماؤں کو خطابات دینے کا طریقہ اس قدر مقبول ہوگیا کہ ہر سیاسی جماعت نے اپنے راہنماؤں کو خطابات دیناشروع کردیئے۔ اسی کی تقلید میں مذہبی جماعتوں نے اپنے راہنماؤں کو خطابات کے ذریعہ آگے بڑھانا شروع کردیا اور بہت جلد ان میں امام شریعت ' امام الہند ' شیخ الاسلام اور مفتی اعظم ملنے لگے۔ بعض اوقات ایک ہی خطاب کئی راہنماؤں کو مل جاتا تھا اور ہر ایک کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ اس کا زیادہ اہل ہے۔

سیاسی راہنماؤں اور مذہبی عالموں کے ساتھ ساتھ یہ رسم شاعروں ' ادیبوں اور دانشوروں میں بھی آگئی اور ان کو رئیس المتغزلین ' لسان العد ' شاعر مشرق اور ابوالاثر کے خطابات ملنا شروع ہوگئے۔

ملک کی تقسیم کے بعد حکومت کی جانب سے خطابات ملنے کی رسم تو ختم ہوگئی مگر اس کے بجائے انعامات کا سلسلہ شروع ہوگیا جو کہ فوجی افسروں' حکومت کے عہدے داراں 'شاعروں ادیبوں اور سائنس دانوں کو ملنے لگے۔ مگر یہ انعامات صلاحیتوں سے زیادہ خوشامد اور تعلقات کی بنیاد پر ملتے ہیں للذا اس خلا کو پورا کرنے کے لئے سیاسی جماعتوں اور مختلف سماجی تنظیموں کی جانب سے خطابات دینے کا سلسلہ جاری ہے۔ للذا قائد عوام' قائد تحریک اور محافظ ملت وغیرہ ہمارے درمیان ہمیشہ موجود رہتے ہیں بلکہ اکثر ان خطابات کو ناکافی سمجھ کر ایسے خطابات بھی دیئے جاتے ہیں کہ جو پاکستانی کی جغرافیائی سرحدوں سے باہر کو اپنے اندر سمولیں جیسے فخر ایشیا یا فخر اسلام وغیرہ۔

خواتین راہنماؤں کے لئے اب تک جو خطابات وضع کئے گئے ہیں ان میں مادر ملت اور دختر ملت قابل ذکر ہیں جو راہنما کسی حادثہ میں مارے گئے یا قتل ہوئے ان کے لئے شہید کا خطاب وقف ہے اور ہمارے ہاں اس خطاب کے حقدار اب تک تین راہنما ہیں۔

ایک خطاب جو ہمارے معاشرے میں بڑا مقبول ہے وہ شیر کا ہے لہٰذا ہر صوبہ میں کوئی نہ کوئی شیر موجود رہتا ہے جیسے شیر بنگال یا شیر پنجاب اور شیر سندھ۔ جانوروں میں شیر کے علاوہ اور کسی جانور کو یہ توفیق نہیں ہوئی کہ وہ خطاب بن سکے اور معاشرے میں اپنے لئے عزت حاصل کرسکے۔

ایک بات تو صاف ہے کہ جب شاندار خطاب دینے کا رواج ہوجائے تو آہستہ آہستہ اس کی معنویت جاتی رہتی ہے اور اس کا تاثر بھی ختم ہوجاتا ہے لیکن ایک ایسے معاشرے میں کہ جہاں ہر طرف کھوکھلا پن ہو جہاں صلاحیتوں کا فقدان ہو اور جہاں قابلیت کی کوئی قدر و قیمت نہ ہو' ایک ایسے معاشرے میں لوگ اپنے راہنماؤں کوخطابات دے کر اپنے جذبات کی تسکین کرلیتے ہیں اور ان راہنماؤں میں جو صلاحیتوں نہیں ہوتی ہیں وہ خطابات کے ذریعہ پیدا کردی جاتی ہیں اس کے علاوہ یہ خطابات ہی ہیں کہ عام لوگوں اور لیڈروں کے درمیان ایک فرق پیدا کرکے انہیں لوگوں سے بلند کردیتے ہیں ورنہ اکثر تو ان راہنماؤں کی ذہنی سطح اور عام آدمی میں کوئی فرق نہیں ہوتا ہے۔ مگر قائد بن کر وہ خود کو ان سے ممتاز سمجھنے لگتا ہے۔

○

نام میں کیا ہے؟

ایک ایسا معاشرہ کہ جہاں لوگوں میں رتبہ و عہدے کا بہت زیادہ احساس ہو' وہاں اور چیزوں کے ساتھ ساتھ نام کے ذریعہ بھی کسی شخص کی حیثیت اور اس کے سماجی مرتبہ کا تعین کیا جاتا ہے۔ قدیم ہندوستان کے قانون دان منو نے اپنے قوانین میں اس بات پر زور دیا ہے کہ ہندوؤں کی چار ذاتیں اپنے بچوں کے نام اپنے سماجی رتبہ کے مطابق رکھیں' مثلاً برہمنوں کے نام سے ان کی نیکیاں اور علم ظاہر ہو! کشتریوں کے نام سے قوت و طاقت'ویش کے نام سے دولت و خوشحالی' اور شودر کے نام سے انکساری اور خدمت!

اس روایت کو کم و بیش ہندوستان میں مسلمانوں نے اپنایا اور ایسے ناموں کو اختیار کیا کہ جو ان طبقوں اور ذاتوں سے متعلق تھے' مثلاً" حکمران طبقوں کے ناموں سے طاقت و قوت اور شان و شوکت و دبدبہ کا اظہار ہوتا تھا جبکہ نچلے طبقہ کے لوگوں کے نام سے ان کی کمتری اور بے وقعتی۔

لہٰذا ہندوستان میں مسلمانوں کے ہاں بچوں کے نام رکھنے میں مختلف رجحانات رہے' سب سے پہلے تو اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ مسلمانوں میں ہندو نام نہ ہوں بلکہ اس کی جگہ عربی اور ایرانی نام رکھے جائیں۔ وہ لوگ بھی کہ جو ہندو سے مسلمان ہوئے' انہوں نے پہلا کام یہ کیا کہ اپنا نام بدلا اور اس کی جگہ کو عربی یا ایرانی نام کو اختیار کیا تاکہ وہ نئی شناخت کے ساتھ مسلمان معاشرہ کا رکن بن سکے۔

ہندوستان کے مقابلہ میں ایران میں اس کے بالکل برعکس ہوا' وہاں عربوں کی فتح

اور مسلمان ہونے کے باوجود ایرانیوں نے اپنی ثقافتی اقدار کو باقی رکھا اور اپنے ایرانی ناموں کو عربی ناموں میں تبدیل نہیں کیا۔ چونکہ ہندوستان میں مسلمان اپنے ساتھ اپنی ثقافت اور اس کی روایات لے کر آئے تھے اس لئے یہاں کے مسلمانوں نے بڑے فخر کے ساتھ ایرانی نام جیسے رستم' سہراب ' خسرو اور شیریں جیسے نام جو کہ ایرانیوں کے مشہور نام ہیں انہیں رکھا' جبکہ اس کے مقابلہ میں ہندو ناموں کو انہوں نے غیر اسلامی کہہ کر رد کردیا۔

ہندوستان کے مسلمان معاشرہ میں طبقہ اعلیٰ سے تعلق رکھنے والوں میں عربی و ایرانی نام رکھنے کا رواج تھا تاکہ اس طرح سے وہ اپنے غیر ملکی ہونے کے تشخص کو برقرار رکھ سکیں' اور ناموں کے ذریعہ اپنے خاندان کی خالصیت اور برتری کا اظہار کرسکیں اس کے مقابلہ میں نچلے طبقے کے لوگوں میں ناموں کو اتنی زیادہ اہمیت نہیں تھی اور وہ اکثر ایسے نام اختیار کرلیتے تھے کہ جن کا تعلق مقامی کلچر اور روایات سے ہوتا تھا۔ اگرچہ اس قسم کا کوئی قانون تو نہیں تھا کہ وہ طبقہ اعلیٰ کے لوگوں جیسے ناموں کو اختیار نہیں کریں مگر عام طور سے وہ ان ناموں کو اختیار کرنے سے گریز کرتے تھے اور ایسے نام رکھتے تھے کہ جو ان کے سماجی رتبہ اور پیشہ سے متعلق ہوتے تھے۔ مثلاً: کلو' جمن' بدھو اور مٹھو وغیرہ جن کا سماجی رتبہ ذرا تھوڑا سا اونچا ہوتا تھا وہ اس قسم کے نام رکھتے تھے' فضل دین' خدا بخش اور اللہ دین وغیرہ۔

طبقہ اعلیٰ کے لوگ اس قسم کے نام رکھتے تھے کہ جن سے ان کے مذہبی لگاؤ اور عقیدت کا اظہار ہو جیسے غلام محمد' آل محمد' عبداللہ' عبدالرسول اور عبدالرحیم وغیرہ۔ دوسری قسم وہ آتی تھی کہ جس میں اخلاقی خوبیوں اور نیکیوں کا اظہار ہوتا تھا' ذکی' انیس' شریف' نیک' صداقت اور امانت وغیرہ تیسری قسم کے ناموں سے جسمانی خوبصورت کا اظہار ہوتا تھا جیسے حسین' نزاکت وغیرہ۔

ہمارے ہاں کے ناموں کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان سے پیشوں کا اظہار نہیں ہوتا ہے جیسا کہ یورپ میں رواج ہے کہ وہاں اسمتھ (لوہار) کارپینٹر (ترکھان) واش

مین (دھوبی) اور بیکر (نانبائی) عام نام ہیں اور ان کو ظاہر کرتے ہوئے کسی کو شرم نہیں آتی۔ چونکہ ہمارے ہاں ان پیشوں کا تعلق نچلے طبقوں سے ہے اس لئے ان کی عزت نہیں کی جاتی ہے۔ اس لئے اگر نچلے طبقہ کا کوئی فرد اپنا سماجی رتبہ بڑھا لیتا ہے تو وہ فوراً" اپنے طبقہ سے تعلق ختم کر کے اونچے طبقہ میں ضم ہونا چاہتا ہے۔ اور اس وجہ سے اس کے ہاں نام بھی بدل جاتے ہیں۔

ہندوستان میں حکمران طبقے ایرانی نام رکھ کر اپنی ہندوستانی رعایا کو مرعوب کرتے تھے اور یہ ثابت کرتے تھے کہ ان کا تعلق ایران کے قدیم شاہی خاندانوں سے ہے اس لئے سلطان بلبن خود کو افراسیاب کی اولاد بتاتا تھا اور اپنے پوتوں کا نام اس نے کیقباد کے خسرو اور کے کاؤس رکھے تھے۔ اکبر بادشاہ نے بھی جب روایتی عقائد کو خیرباد کہا تو اس نے بھی اپنے پوتوں کے نام خسرو اور پرویز رکھے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے ایران' وسط ایشیا' مشرقی افریقہ اور مشرق بعید کے ملکوں کی طرح مسلمان ہونے کے باوجود اپنے مقامی ناموں کو کیوں برقرار نہیں رکھا؟ تو اس کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ چونکہ ہندوستان میں اکثریت مسلمان نہیں ہوئی' اس لئے ہندوستانی کا فرق باقی رہا اور پھر یہ فرق حکمران اور رعیت کے درمیان بھی تھا۔ جو غیر ملکی مسلمان ہندوستان میں آئے انہوں نے خود کو مقامی لوگوں سے دور رکھ کر اپنی شناخت کو باقی رکھا اور اس میں نام کا اہم کردار رہا ہے کہ جس نے اس دوری کے فرق کو ظاہر کیا اور اس کے ذریعہ سے حکمران و مراعات یافتہ طبقوں نے اپنے اعلیٰ سماجی رتبہ کو استحکام دیا۔

عورتوں کے نام میں کیا ہے؟

ہندوستان کے مسلمان معاشرہ میں عورت کا مقام مرد کے مقابلہ میں کم تر ہے' مگر اس سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ خاندان کی تمام صفات اور خوبیوں کی حفاظت کرے اور اس کی عزت کو ہمیشہ بچائے رکھے اس لئے امراء اور طبقہ اعلیٰ کی عورتوں کے نام

سے جہاں ایک طرف ان کے سماجی رتبہ کا پتہ چلتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معاشرہ میں ان کا کیا کردار ہے۔

طبقاتی اعتبار سے عورتوں کی تین قسمیں تھیں جو اپنے اعتبار سے علیحدہ قسم کے نام رکھتی تھیں۔ مثلاً طبقہ اعلیٰ کی خواتین کے نام روایتی اور تاریخی ہوتے تھے، جیسے خدیجہ، عائشہ، فاطمہ، اور صدیقہ وغیرہ۔ ان کی زندگی گھروں تک محدود رہتی تھی اور معاشرہ میں انہیں کسی قسم کی عملی سرگرمیوں کی اجازت نہ تھی۔ اس طبقہ سے تعلق رکھنی والی عورتوں سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ وفادار، اطاعت گزار، عصمت و عفت والی اور اپنے مردوں کی بات ماننے والی ہوں اور ان کے نام کے ساتھ جس سیرت کا تعلق ہے وہ اسے اپنے کردار اور اعمال میں باقی رکھیں۔

ایک اطالوی سیاح نکولاؤ منوچی (وفات ۱۷۱۷ء) ہندوستان آیا تھا اور یہاں اس نے ایک طویل عرصہ مغل سلطنت میں گزارا تھا۔ اپنے مشاہدات پر مبنی اس نے تین جلدوں میں ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ اس نے اپنی کتاب میں مغل دربار میں رہنے والی خواتین کے نام لکھے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس عہد میں نام عورت کے سماجی رتبہ اور حیثیت کو دیکھ کر رکھے جاتے تھے۔ مثلاً" شہزادیوں اور ملکاؤں کے نام تھے نورجہاں، فرزانہ بیگم، ماہ بیگم، شاہ خانم، نادرہ بیگم، روشن آرا، جہاں آرا اور زیب النساء وغیرہ

داشتاؤں کے نام تھے نازک بدن، سنگھار، پیار، چمبیلی، موتیا وغیرہ ناچنے والی عورتوں کے نام تھے، لال بائی، ہیرا بائی، رس بائی، چینچل بائی، اپسرا بائی۔ کنیزوں کے نام تھے گلاب، نرگس اور سوسن وغیرہ۔ آگے چل کر طوائفوں کے نام بڑے دلفریب اور لبھانے والے ہوگئے جیسے خوش نگاہ، دل افروز، نین سکھ، دل آرام، اور مہ لقا وغیرہ

ناموں کے اس طبقاتی انداز سے معاشرہ میں عورتوں کی سماجی حیثیت اور ان کے عمل کے بارے میں پتہ چل جاتا ہے۔ مثلاً جن عورتوں کا تعلق طبقہ اعلیٰ اور امراء کے خاندانوں سے ہوتا تھا وہ گھروں میں یا حرم میں مقید رہتی تھیں اور ان پر یہ فرض تھا کہ

وہ خاندان کے لئے وارث پیدا کریں' جبکہ طوائفیں اور کنیزیں مرد کی ذہنی تشنگی کو بجھاتی تھیں اور معاشرہ کی ثقافتی سرگرمیوں میں حصہ لیتی تھیں۔ اس لئے طبقہ اعلیٰ کی خواتین کے نامون سے اعلیٰ صفات کا اظہار ہوتا تھا جب کہ دوسری عورتوں کے ناموں سے خوبصورتی' دلکشی رعنائی اور حسن کا۔

اب موجودہ دور میں ناموں کے یہ انداز بدل گئے ۔ چونکہ آہستہ آہستہ ہماری عورتوں میں شعور بڑھ رہا ہے اور انہیں اپنے حقوق کا احساس ہورہا ہے۔ اس لئے ناموں کے سلسلہ میں اب قدیم روایات ترک کردی گئیں ہیں۔ خصوصیت سے تاریخی اور روایتی ناموں کا سلسلہ تقریباً" ختم ہوگیا ہے۔ بلکہ دلچسپ چیز یہ ہے کہ طبقہ اعلیٰ کے ہاں اب یہ نام شاذو نادر ہوتے ہیں۔ ہاں متوسط طبقے میں جو قدیم روایات کو محفوظ رکھنا چاہتا ہے اس کی عورتوں میں اب بھی یہ نام مل جاتے ہیں۔ مگر طبقہ اعلیٰ اب بھی اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنی عورتوں کے نام میں جدیدیت اور ندرت رکھے' اور یہ نام نچلے طبقے کی عورتوں سے علیحدہ ہوں اس لئے اب ایک نیا رجحان یہ پیدا ہوا ہے کہ اپنی عورتوں کے یورپی نام رکھے جائیں اس لئے نتاشا' انیتا' اور سارہ آج کل مقبول نام ہیں۔ اکثر وہ ایسے نام بھی ایجاد کرلیتے ہیں جن کے کوئی معنی نہیں ہوتے لیکن جن سے جدت اور یگانہ پن ظاہر ہوتا ہو۔

طبقہ اعلیٰ کے افراد کے اس رجحان سے کہ وہ عورتوں کہ یورپی نام رکھ رہے ہیں' یہ پتہ چلتا ہے کہ کس طرح سے پوری تاریخ میں انہوں نے مقامی کلچر اور روایات کو نظرانداز کرکے غیر ملکی کلچر کو اپنایا ہے تاکہ اس طرح وہ نچلے طبقوں سے کہ جو مقامی کلچر سے تعلق رکھتے ہیں علیحدہ ہوکر' اپنی علیحدہ شناخت کو برقرار رکھیں۔

○

شریف خاندان

فیوڈل کلچر میں کسی فرد کا رتبہ اس کی ذہانت' صلاحیت اور قابلیت سے متعین نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کے خاندان اور حسب نسب سے ہوتا ہے اس کلچر میں خاندان کو اس لئے اہمیت دی جاتی ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے مراعات کو ایک خاص حلقہ میں محدود کردیا جاتا ہے اور جو اس سے باہر ہوتے ہیں انہیں یہ حق نہیں دیا جاتا ہے کہ وہ ان خاص مراعات سے فیض یاب ہوسکیں اس وجہ سے ہمارے معاشرے میں خاص طور سے وہ خاندان کہ جن کے پاس جاگیریں ہیں زمین کی ملکیت کی وجہ سے' اور وہ لوگ کہ جن کا تعلق سید گھرانے اور صوفی خاندان سے ہو' اپنے مذہبی تعلق کی وجہ سے اہم خاندان ہوتے ہیں اور ان کی حیثیت دوسرے گھرانوں سے افضل اور برتر ہوجاتی ہے۔ اس لئے وہ افراد کہ جن کا ان دو گھرانوں سے تعلق ہوتا ہے وہ خود کو دوسرے لوگوں سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں اور ان کی کوشش ہوتی ہے کہ کوئی اور ان کے حلقہ میں شامل ہوکر ان کی مراعات میں سے حصہ نہیں بٹائے۔ اس لئے خاص طور سے شادی بیاہ کے سلسلہ میں یہ ان رسومات و دستوروں کی پابندی کرتے ہیں کہ کوئی غیر ان میں داخل نہیں ہوپائے۔

ان خاندانوں کا یہ دستور ہے کہ جب کبھی کوئی فرد ان کی مراعات کو چھیننے کی کوشش کرتا ہے یا ان کی حیثیت پر تنقید کرتا ہے تو ایسے شخص کو یہ لوگ فوراً" یہ کہہ کر ذلیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس کا تعلق نچلی ذات یا خاندان سے ہے اس لئے یہ کوئی حق نہیں رکھتا کہ ان کی برابری کرے۔ چونکہ ہمارے معاشرے میں سماجی

رتبہ کی بڑی اہمیت ہے اس لئے اگر کسی کا تعلق نچلی ذات یا پیشہ والوں سے ہوجائے تو اس صورت میں وہ فوراً ہی لوگوں کی نظروں میں سے گرجاتا ہے اس لئے ہر آدمی اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اس کا تعلق کسی اونچی اور اعلیٰ ذات سے ہوجائے اور اگر اس کے پاس پیسہ آجاتا ہے تو وہ فوراً کسی اعلیٰ خاندان سے خود کو منسلک کرنا شروع کردیتا ہے۔

خاندان اور ذات پات کی تقسیم کو ہمارے ہاں تاریخ کے ذریعہ اور بھی زیادہ مستحکم کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں دلچسپ بات یہ ہے کہ جس طرح سے کہ اس مسئلہ کو قرون وسطی کے مورخ لیتے تھے اس طرح سے آج بھی اس کو ایسے ہی دکھایا جاتا ہے۔ اس عہد میں بھی اپنے مخالفوں اور دشمنوں کو ذلیل کرنے کے لئے یہ ثابت کیا جاتا تھا کہ اس کا تعلق نچلے گھرانے سے ہے اور آج بھی اس حربہ کے ذریعہ اپنے مخالفوں کو ذلیل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ قرون وسطی کے زمانہ میں چونکہ سپاہیانہ پیشہ کی عزت تھی کیونکہ اس عہد میں جنگ کے ذریعہ ہی سلطنتیں قائم رہتی تھیں اور وسیع ہوتی تھیں اس لئے سپاہیانہ خوبیوں کی تعریف کی جاتی تھی۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے وہ تمام پیشے کہ جن کا تعلق کاروبار سے تھا اور جن میں جنگ و جدل سے کوئی تعلق نہیں تھا ایسے پیشوں کو نچلا اور کم تر سمجھا جاتا تھااس لئے سپاہی اور فوجی لوگ کاروباری لوگوں اور تاجروں کو ذلیل سمجھ کر ان کی کوئی عزت نہیں کرتے تھے۔

یہ رجحان اس وقت کی تاریخ کی کتابوں سے پوری طرح سے ظاہر ہوتا ہے مثلاً ہیمو جو کہ سوری خاندان کا ایک جرنل تھا اسے پانی پت کی جنگ میں اکبر کے ہاتھوں ۱۵۵۶ء میں شکست ہوئی۔ مغل مورخوں نے بجائے اس کے کہ اس کی تعریف کریں اور اس کی بہادری اور شجاعت کی داد دیں۔ اس کو ایک غیر اہم اور معمولی شخص کی حیثیت سے اپنی تاریخ کی کتابوں میں پیش کیا ہے۔ عبدالقادر بدایونی اور ابوالفضل نے اسے بقال کے نام سے یاد کیا۔ ابوالفضل نے جس طرح سے اس کا تذکرہ اپنی کتاب اکبر نامہ میں کیا اس سے اس کے عہد کے تعصبات ہمارے سامنے آتے ہیں وہ لکھتا ہے کہ

نہ تو اس کا کوئی حسب تھا اور نہ نسل، نہ ہی وہ کسی سیرت کا مالک تھا اور نہ ہی صورت کا۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ دراصل ہیمو کا تعلق رواڑی کے ایک معمولی دکاندار گھرانہ سے تھا اور وہ شہر کی گلیوں میں وہ بہت سارے دوسرے پھیری والوں کی طرح نمک شورہ بیچا کرتا تھا۔ اس طرح سے وہ ہیمو کی صلاحیتوں کو کم کرکے اسے خاندانی طور پر نچلا ثابت کرکے اور حقیر و بے کار شخص ثابت کرنا چاہتا تھا اور مطلب اس سے یہ تھا کہ اس کا اور اکبر کا جو عالی خاندان کا فرد تھا کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔

مغل مورخوں نے اس رجحان کو شیر شاہ شوری اور اس کے خاندانوں کے لئے بھی اختیار کیا ہے کیونکہ شیر شاہ سوری نے ہمایوں کو شکست دے کر ہندوستان سے نکال دیا تھا۔ اس لئے ابوالفضل نے اس کا انتقام اس طرح لیا اسے کہیں بھی شیر شاہ نہیں لکھا بلکہ اس کی جگہ شیر خان کے نام سے اس کا تذکرہ کیا ہے تاکہ یہ ثابت کیا جاسکے کہ وہ بادشاہ نہیں بلکہ ایک معمولی زمیندار تھا۔ اس کے بعد ابوالفضل نے اس کے باپ کے بارے میں لکھا کہ وہ معمولی گھوڑوں کا تاجر تھا لہٰذا اس کا خاندان کوئی اعلیٰ نہیں تھا اور وہ اس قابل نہیں تھا کہ تیموری خاندان کا مقابلہ کرسکے۔

شریف خاندان کی اس روایت کو برطانوی حکومت نے بھی اپنے زمانہ میں باقی رکھا اور فوج و انتظامیہ میں لیتے وقت خاندانوں کو اہمیت دی۔ ان شریف خاندانوں کے افراد نے برطانوی حکومت کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا اور اس کے بدلہ میں اپنی مراعات اور حیثیت کو برقرار رکھا۔

ملک کی تقسیم کے بعد بھی ہمارے معاشرے کا سماجی ڈھانچہ اسی طرح سے برقرار رہا۔ جو زمیندار گھرانے تھے اور جن کا صوفیوں اور سادات کے خاندانوں سے تعلق تھا ۔ چونکہ وہ خاندانی مراعات کے وارث تھے اس لئے انہوں نے ان روایات کو برقرار رکھا اور اس کے ذریعہ ملک کی دولت اور ذرائع پر قبضہ کرکے ریاستی اداروں کے ذریعہ اپنی مراعات اور طاقت کو مزید بڑھایا۔ ان طبقات کے مفاد میں یہ ہے کہ معاشرے میں

یہ روایات باقی رہیں تاکہ صلاحیتوں کے بجائے خاندانی بنیادوں پر ہر چیز کو حاصل کیا جاسکے۔ دیکھا جائے تو پاکستان اس لئے پس ماندہ نہیں ہے کہ یہاں ۲۲ یا اس سے زیادہ صنعتی خاندان ہیں بلکہ اس لئے پیچھے ہے کہ یہاں ہزاروں کی تعداد میں چھوٹے و بڑے جاگیردار ہیں جو معاشرہ کو پس ماندہ بنائے ہوئے ہیں۔

○

نفرت کی سیاست

فیوڈل کلچر میں یا تو انتہائی نفرت ہوتی ہے یا گہری دوستی۔ بدقسمتی سے اس میں رواداری کا درمیانی راستہ موجود نہیں ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس میں تنقید کو ذاتی حملہ تصور کیا جاتا ہے۔ اور اگر بحث و مباحثہ ہو تو اس میں دونوں فریقوں کی جانب سے یہ کوشش ہوتی ہے کہ ایک دوسرے کو لاجواب کرکے شکست دی جائے۔ اور فریق کے دلائل سے قائل ہونے کے باوجود غلطی تسلیم نہ کی جائے۔ اس لئے انہیں لوگوں کو عزت ملتی ہے کہ جو یا تو جسمانی طور پر طاقت ور ہوتے ہیں یا جن کے پاس اقتدار ہوتا ہے۔ اگر کوئی کسی سے سمجھوتہ کرنا چاہے تو اسے کردار کی کمزوری مانا جاتا ہے۔ جب کسی مسئلہ پر گفتگو ہو تو کوشش ہوتی ہے کہ یہ مساوی بنیادوں کی بجائے ' اعلیٰ و ادنیٰ کے حساب سے ہو۔ لہٰذا ان روایات کی وجہ سے ہمارا کلچر اقتدار ' طاقت اور اختیارات کو تسلیم کرنے والا ہے۔ جس کے پاس یہ چیزیں نہیں ہیں معاشرے میں اس کی عزت بھی نہیں ہے۔

لہٰذا اقتدار اور اختیارات کے حصول میں اگر کوئی حائل ہوتا ہے تو وہ دشمن ہے اور ایسے شخص کو یا تو ختم کردیاجاتا ہے یا اسے سازش کے ذریعہ ناکارہ بنا دیا جاتا ہے۔ کیونکہ فیوڈل کلچر میں کوئی یہ برداشت نہیں کرتا ہے کہ مخالفین کے ساتھ مل کر اقتدار میں شرکت کی جائے۔ بلکہ ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ یا تو اختیارات مکمل ہوں یا کسی کو بھی نہ ملیں۔ یعنی یا تو ہم حکومت کریں گے یا کسی کو نہ کرنے دیں گے۔

اس سیاسی کلچر کی جڑیں مغل دور حکومت تک چلی جاتی ہیں خاص طور سے اس

عہد میں کہ جو زوال کا زمانہ تھا اس وقت مغل امراء جس طرح سے ایک دوسرے سے سلوک کر رہے تھے' ہمارے سیاست دان آج انہیں رویوں کو اختیار کئے ہوئے ہیں۔ یہ وجہ کہ کیوں یورپی اقوام اور خصوصیت سے اہل برطانیہ ہندوستان پر قابض ہوگئے' اس کے پس منظر میں بھی امراء اور والیان ریاست کی باہمی دشمنی اور رقابت تھی کہ جو چاہتے تھے کہ اپنے دشمنوں اور مخالفوں کو ختم کرکے وہ تمام ذرائع اور اختیارات کو حاصل کرلیں۔ اس باہمی نفرت اور دشمنی نے یورپی اقوام کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ ان کے اندرونی معاملات میں دخل دیں۔ اور ایک دوسرے کی حمایت کرکے ان سے زیادہ مراعات اور فوائد حاصل کریں۔ ہندوستان کے والیان ریاست نے خوشی سے امداد کے عوض یورپی قوم کو زمین دے دی' مگر یہ گوارہ نہیں کیا کہ اپنے حریف سے سمجھوتہ کرلیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آخر میں انہوں نے بھی اپنا سب کچھ کھو دیا مگر انہیں اس بات کی خوشی رہی کہ ان کے دشمنوں کو بھی کچھ نہیں ملا۔

اس رجحان کو سمجھنے کے لئے آخری عہد مغلیہ کا یہ واقعہ قابل ذکر ہے کہ جب نادر شاہ دہلی کا محاصرہ کئے ہوئے تھا تو اس کے ساتھ بات چیت کے ذریعہ یہ بات طے ہوگئی کہ وہ کثیر رقم بطور معاوضہ لے کر ہندوستان چلا جائے گا۔ صلح کی بات چیت کے دوران ایک مغل امیر سعادت خاں برہان الملک' جو نادر شاہ سے یہ گفتگو کر رہا تھا' اسے اطلاع ملی کہ بادشاہ نے اس کے حریف نظام الملک کو امیر الامراء کے عہدے پر فائز کردیا ہے۔ اس عہدے کے لئے وہ خود بھی امیدوار تھا لہٰذا اس خبر کو سن کو وہ اس قدر مایوس ہوا کہ اس نے نادر شاہ سے کہا کہ وہ اپنے ذاتی خزانہ سے اس قدر روپیہ دے سکتا ہے جو بادشاہ نے منظور کیا تھا۔ اس کے بعد اس نے نادر شاہ کو مغل بادشاہ کی دولت اور امراء کے بارے میں تفصیل بتا کر کہا کہ اسے دہلی پر قبضہ کرکے یہ سب حاصل کرنا چاہئے۔

ان حالات میں نادر شاہ نے فیصلہ کرلیا کہ شہر پر قبضہ کرکے اسے لوٹے گا۔ لہٰذا اس لوٹ مار کے نتیجہ میں نہ صرف تمام مغل خزانہ ہاتھ سے گیا بلکہ امراء بھی اذیتوں

کے بعد اپنی دولت سے محروم ہوئے۔ دولت کی لوٹ مار کے ساتھ شہر میں جو قتل عام ہوا وہ علیحدہ۔ جب نادر شاہ دہلی چھوڑ کر گیا ہے تو شہر ویران ہو چکا تھا اور اس کی شان و شوکت ختم ہو چکی تھی۔

اس تمام کہانی کا المیاتی پہلو یہ تھا کہ برہان الملک نادر شاہ کے حملے کے دوران زخمی ہوا اور مر گیا۔ نظام الملک حالات سے مایوس ہو کر دہلی چھوڑ کر چلا گیا اور دکن میں اپنی خود مختار سلطنت قائم کر لی۔ انتظامی حالات کے بگاڑ سے جو نتیجہ برآمد ہوا وہ سیاسی ٹوٹ پھوٹ اور انتشار میں تھا کہ جس سے فائدہ اٹھا کر مراہٹوں ' جاٹوں اور روہیلوں نے پورے ملک میں لوٹ کھسوٹ شروع کر دی۔

اگرچہ اب حالات بدل چکے ہیں اور امراء اور بادشاہوں کا زمانہ تو نہیں رہا ہے مگر باہمی نفرتوں کا چکر جاری ہے۔ اگرچہ ہمارے ہاں جمہوری نظام آگیا ہے کہ جس میں طاقت و اقتدار بدلتا رہتا ہے۔ ہارنے والے کے لئے یہ موقع ہوتا ہے کہ وہ عوامی رائے کو ہموار کر کے آئندہ الیکشن میں جیت جائے۔ اس لئے سیاسی اختلافات کو برداشت کرنا ضروری ہوتا ہے اور مخالفتوں کو ختم کرنے کی بجائے ان کو ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے۔ مگر فیوڈل کلچر نے ہمارے سیاست دانوں کا جو ذہن بنایا ہے اس میں رواداری کی روایات مفقود ہیں اگرچہ اب نادر شاہ تو حملہ آور نہیں ہوگا اور نہ ہی اس طرح سے لوٹ مار ہوگی مگر اس نفرت کی سیاست کی وجہ سے سیاست دان فوج کو یہ موقع فراہم کریں گے کہ وہ سیاسی معاملات میں حصہ لے اور اس طرح سیاست دانوں کی طاقت کو ختم کر کے اسے کم کر کے سیاسی نظام کی افادیت محدود کر دے۔ اس سیاسی انتشار کی وجہ سے غیر ملکی طاقتوں کو بھی یہ موقع ملے گا کہ وہ ملک کے اندرونی اور بیرونی معاملات میں دخل اندازی کریں اور اپنے مفادات کو حاصل کریں۔

اس لئے جمہوری طریقہ حکومت کو مضبوط کرنے کے لئے فیوڈل کلچر کی جگہ جمہوری کلچر کی ضرورت ہے کہ جس میں رواداری اور قوت برداشت ہوتی ہے۔

اکبر پاکستانی نصاب کی کتابوں میں

پاکستان میں جب سے معاشرتی علوم کو نصاب کا حصہ بنایا گیا ہے اس کے بعد سے تاریخ اور جغرافیہ کی اپنی آزادانہ حیثیت ختم ہوگئی ہے وہ اس کا ایک حصہ بن کر رہ گئے ہیں۔ جب ملک میں تعلیم کو اسلامی بنانے کا عمل شروع ہوا تو اس کے نتیجہ میں معاشرتی علوم سب سے زیادہ متاثر ہوئے اور انہیں ریاست نے اپنے نظریات کے فروغ کا ذریعہ بنایا اور طالب علموں کو صرف وہ معلومات فراہم کی گئیں کہ جو ریاست کے لئے مفید ہیں۔

معاشرتی علوم میں تاریخ کا جو حصہ ہے اسے خاص طور سے ہر آنے والی حکومت نے اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کیا اور ملک کی پوری تاریخ پڑھانے کی بجائے اس کے ان حصوں کو اس میں شامل کرلیا کہ جوان کے نظریات کے موافق تھے۔ اس میں خاص طور سے جس بات پر زور دیا گیا وہ دو قومی نظریہ ہے تاکہ تاریخ سے یہ ثابت کیا جائے کہ برصغیر ہندوستان میں ہمیشہ سے دو قومیں اپنے علیحدہ کلچر کی حیثیت سے رہی ہیں اور یہاں کبھی بھی ایک جامع کلچر جو ہندو اور مسلمان دونوں کے اشتراک سے بنا ہو کبھی نہیں رہا۔ چونکہ اکبر دو قومی نظریہ کے اس فریم ورک میں نہیں آتا تھا اس لئے اسے نصاب کی کتابوں میں بالکل نظرانداز کردیا گیا ہے اور وہ اسکول کی نصاب کی کتابوں میں میٹریکولیشن تک کسی کتاب میں نہیں آتا ہے۔

اس کے مقابلہ میں اورنگ زیب کا ذکر مختلف نصاب کی کتابوں میں آتا ہے جن میں معاشرتی علوم اور اردو کی کتابیں ہیں۔ اورنگ زیب کو ان کتابوں میں ایک متقی

پرہیز گار مسلمان کے بتایا گیا ہے کہ جو ٹوپیاں سی کر اور قرآن لکھ کر اپنی روزی پیدا کرتا تھا۔

چونکہ اسکول کی نصابی کتابیں مرکزی اور صوبائی ٹیکسٹ بک بورڈ کی جانب سے تیار کرائی جاتی ہیں اس لئے حکومت اور نجی سکولوں کے لئے لازمی ہے کہ وہ ان نصابی کتابوں کو اس میں شامل کریں۔ اس لئے طالب علموں کے لئے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں رہ جاتا ہے کہ وہ ان منظور شدہ نصاب کی کتابوں کو پڑھیں۔ کیونکہ نصابی نقطہ نظر سے ہٹ کر اگر لکھا جائے گا تو امتحان پاس کرنا ناممکن ہوجائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو طالب علم صرف میٹریکولیشن تک پڑھتے ہیں انہیں اکبر کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ہوتی ہیں۔

۱۹۷۰ء کی دھائی میں "مطالعہ پاکستان" کے نام سے ایک مضمون پرائمری سے لے کر یونیورسٹی اور پروفیشنل کالجوں تک میں متعارف کرایا گیا اس کا مقصد یہ تھا کہ نئی نسل جو پاکستان کی ابتداء اور اس کے نظریہ سے واقف نہیں ہے اسے اس کے بارے میں معلومات پہنچائیں جائیں۔ مطالعہ پاکستان کے لئے جو نصاب کی کتابیں تیار ہوئیں ان میں خاص طور سے دو قومی نظریہ کو تاریخی لحاظ سے صحیح ثابت کیا گیا ہے اس میں اکبر کا ذکر بحیثیت مدبر کے نہیں بلکہ اسے احمد سرہندی (وفات ۱۶۲۴) کے ایک مخالف کی حیثیت سے دکھایا گیا ہے کہ جنہوں نے اکبر کی مذہبی پالیسی کی مخالفت کرتے ہوئے اسلام کی حفاظت کی اور اس کی اقدار کا احیا کیا۔ یہاں ایک نصاب کی کتاب سے اقتباس دیا جارہا ہے کہ جس سے اس نقطہ نظر کو سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

> "احمد سرہندی عظیم صوفی اور عالم کہ جنہوں نے اکبر کی طاقت کو چیلنج کیا اور برصغیر میں اسلام کی شان و شوکت کا احیا کرکے اسے قائم کیا۔ مغل بادشاہ نے ایک مذہبی فلسفہ شروع کیا تھا جو دین الٰہی کے نام سے موسوم تھا۔ یہ ایک ناکام کوشش تھی کہ جس میں اکبر نے ہندومت کے اجنبی عقائد کواسلام میں شامل کیا۔ احمد سرہندی نے اپنی پوری قوت و طاقت سے دین

الٰہی کے اثر کو جس کا واحد مقصد اسلام کو مسخ کرنا تھا' دبانے کی کوشش کی۔"

(اکرام ربانی : پاکستان اسٹڈی کا ایک تعارف۔ لاہور ۱۹۹۱ء ص ۲۲ ۔ ۲۳)

یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے کہ

"حضرت مجدد نے احیاء اسلام کی جس تحریک کی بنیاد ڈالی تھی اس سے دو قومی نظریہ کی ابتداء ہوئی جس نے آگے چل کر پاکستان بنانے میں اہم حصہ لیا۔

(ایضاً" ص ۔ ۲۳)

یہ ثابت کرنے کے لئے احمد سرہندی دو قومی نظریہ کے بانی ہیں اور اسلام کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ اس مقصد کے لئے اکبر کو ضرورت سے زیادہ مسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور اسے اسلام کا دشمن بنا کر پیش کیا گیا ہے۔ اس بحث میں اکبر اور احمد سرہندی دو متضاد طاقتوں کی صورت میں ابھرتے ہیں کہ جو خیر و شر کی لڑائی اور جنگ ہے۔ اس جنگ میں اکبر کو نصاب کی کتابوں کے مصنفوں کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست ہوتی ہے۔

اسکول کے بعد تاریخ کا جو مضمون کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے اس میں سلاطین اور مغل دور حکومت شامل نصاب ہیں۔ اگرچہ یہاں پر کوئی سرکاری طور پر منظور شدہ نصاب کی کتاب نہیں ہے۔ لیکن اکثر نصاب کی کتابوں کے مصنفین ریاست کے نقطہ نظر کو اپناتے ہوئے اس کے مطابق تاریخ لکھتے ہیں۔ ان نصاب کی کتابوں کے مصنفوں کے ہاں تذبذب ملتا ہے۔ وہ ایک طرف تو اکبر کی مذہبی پالیسی کی مخالفت کرتے ہوئے اس کے اس رواداری رویہ پر تنقید کرتے ہیں کہ جو اس نے ہندوؤں کے سلسلہ میں اختیار کیا' لیکن دوسری طرف وہ اکبر کی ایک فاتح اور بہترین منتظم کی حیثیت سے تعریف بھی کرتے ہیں۔ یہاں خطرہ یہ ہے کہ اگر اکبر کو اسلام سے خارج کردیا جائے تو وہ ایک بہت بڑے بادشاہ سے محروم ہوجائیں گے۔

ایک دوسرا نقطہ نظر جو ہندوستان میں مسلم سیاست کے دوران پیدا ہوا اور جسے بعد میں آئی ایچ قریشی نے بھی اختیار کیا وہ یہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال کی ذمہ داری اورنگ زیب پر نہیں بلکہ اکبر پر آتی ہے اس سلسلہ میں قریشی صاحب کا موقف یہ ہے کہ اکبر نے ہندوستان میں سیاست کی مکمل طور سے نئے سرے سے ترتیب دی اگرچہ اس وقت تک مسلمان ریاست پر حاوی تھے لیکن اکبر کی اس تبدیلی کی وجہ سے مغل سلطنت مسلمان ریاست نہیں رہی اور وہ مسلمانوں کی حمایت پر اس طرح سے بھروسہ نہیں کرتی تھی جیسے کہ سلاطین دہلی نے کیا تھا۔ اب مسلمان بھی اور دوسری جماعتوں کی طرح سے ایک جماعت ہوگئے تھے کہ جو ریاست کے عہدوں پر تھے اور اس کی حفاظت کرنے والوں میں شامل تھے۔ اکبر نے اس طرح سے اسلام کو اس قدر کمزور کردیا کہ وہ دوبارہ سے اپنی بالادستی کو قائم نہیں کرسکا۔

(آئی۔ ایچ قریشی: برصغیر میں ملت اسلامیہ' دی ہیگ ۱۹۲۶ ص۔ ۱۶۷۔ ۱۶۸)

کچھ مصنفوں نے اشتیاق حسن کے اس نقطہ کو یا تو اسی طرح سے اپنی نصاب کی کتابوں میں شامل کردیا ہے یا ان کے دلائل کے ذریعہ اکبر کی ہندوؤں کی پالیسی پر تنقید کی ہے ایک مصنف شیخ محمد رفیق نے تاریخ پاک و ہند میں اکبر کی راجپوت پالیسی کے دو پہلوؤں پر بحث کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ اکبر کی راجپوت پالیسی کے منفی اثرات ہوئے۔ اس نے راجپوتوں کی اس قدر کھل کر حمایت کی کہ مسلمان امراء نے اس پر اعتماد کرنا چھوڑ دیا اور ان کے نزدیک مغل حکومت مسلمانوں کی نہیں رہی۔ اس موقع پر مجدد الف ثانی اور ان کے مریدوں نے جدوجہد کی کہ اس کو تبدیل کیا جائے۔

(شیخ محمد رفیق تاریخ پاکستان و ہند لاہور ۱۹۹۲ء۔ ۱۱۵)

اس کے ساتھ مصنف یہ بھی لکھتا ہے کہ راجپوتوں نے مغلوں کے دور حکومت میں اہمیت حاصل کرلی۔ اگر راجہ مان سنگھ اور بھگوان داس مغلوں کی ملازمت میں نہیں آتے تو وہ تاریخ میں گمنامی کی موت مرجاتے۔ ان کے تعلقات مسلمانوں سے فائدہ مند رہے کیونکہ مسلمان بہت زیادہ مہذب اور تعلیم یافتہ تھے جس کی وجہ سے راجپوت پس

ماندگی سے نکل آئے۔

(ایضاً: ص - ۱۱۴)

اسی وجہ سے کچھ مصنفوں نے یہ دلیل دی ہے کہ راجپوتوں کے مغل سلطنت میں اشتراک سے ان میں سیاسی شعور آیا۔ انہوں نے جنگ کے تجربات حاصل کئے اور انتظامی امور میں مہارت حاصل کی اور یہی وجہ تھی کہ آگے چل کر یہ حمایتی مسلمانوں کے خطرناک دشمن بن گئے اور جو کچھ انہوں نے مسلمانوں سے سیکھا تھا اب ان ہی کے خلاف استعمال کیا بقول اشتیاق حسین قریشی کہ ابتداء میں مسلمانوں نے بڑے اطمینان بلکہ فخر کے ساتھ دیکھا کہ ہندو مسلمانوں کی حمایت کی خاطر تلوار اٹھائے ہوئے ہیں۔ لین بعد میں انہیں احساس ہوگیا کہ یہ تلوار ہمیشہ اسلام کی حمایت میں نہیں رہی۔

(قریشی: ص - ۱۶۷)

شیخ رشید نے "پاکستان کی مختصر تاریخ" میں جسے کہ پاکستان کے مشہور مورخین کی زیر نگرانی تیار کیاگیا اور جس کے جنرل ایڈیٹر اشتیاق حسین تھے اکبر کے بارے میں تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر مسلمان اپنی شناخت کو بھول جاتے اور اکبر کی پالیسی کے مطابق متضاد عقائد اور رجحانات کو اختیار کرلیتے تو اس صورت میں ان کا برصغیر میں بحثیت ایک قوم کے وجود ختم ہوجاتا۔ اکبر کی پالیسی نے نہ صرف مسلمان ریاست کو خطرے میں ڈال دیا بلکہ مسلمانوں کو بھی تباہی کے راستہ پر ڈال دیا۔

(شیخ رشید: پاکستان کی مختصر تاریخ کرچی ۱۹۸۸ء ص ۴۹۳)

شیخ رشید تاریخ میں سیکولر نظریات کے حامی تھے اس لئے ان کے شاگردوں کو جنہیں وہ علی گڑھ میں پڑھاتے رہے تھے اس پر تعجب ہوا کہ انہوں نے کتاب کے مغلیہ دور کو لکھتے ہوئے کیوں اپنے خیالات کو بدل دیا۔ بعد میں شیخ رشید نے بتایا کہ ان کے مضمون میں اکبر کے بارے میں یہ اضافے اشتیاق حسین قریشی نے ان سے پوچھے بغیر اپنی طرف سے کردیئے تھے۔

اس طرح نصاب کی کتابوں اور علمی تحریروں میں اکبر پر تنقید کی گئی ہے کہ اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو باہم ملا کر ایک قوم بنانے کی کوشش کی اور اس کی وجہ سے برصغیر میں مسلمانوں کی علیحدہ شناخت کمزور ہوگئی چونکہ اس طرح سے پاکستان میں دو قومی نظریہ کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس لئے اکبر کی شخصیت پاکستان میں مقبول عام نہیں ہے۔

اور پھر ایک ایسے معاشرے میں کہ جہاں رواداری نہ ہو' جہاں مذہبی اقلیتوں کو ثانوی درجہ دیا گیا ہو' جہاں فرقہ پرستی کو ریاست کی جانب سے تحفظ ملتا ہو' جہاں علماء کو اس بات کی پوری آزادی ہو کہ جسے چاہیں کافر قرار دیں' اور جسے چاہیں واجب القتل کردیں' جہاں سیکولر اور روشن خیال لوگ ملک دشمن اور غیر ملکی ایجنٹ کہلائیں' جہاں بنیاد پرست جماعتوں کو قتل و غارت گری کی آزادی ہو' جہاں روشن خیال نظریات والی کتابیں ممنوع ہوں یا جلا دی جائیں' جہاں عورتوں پر ظلم جائز ہو' اور جہاں دانشوروں پر پابندیاں ہوں' ایسے ماحول میں اکبر جو کہ رواداری' روشن خیالی اور سیکولر ازم کی علامت ہے' اسے کیسے برداشت کیا جاسکتا ہے۔ اکبر کی ایک ایسے معاشرے میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔

تاریخ اور بچپن

ایک زمانہ تک انسان میں یہ شعور نہیں تھا کہ وہ انسانی زندگی میں بچپن کی اہمیت کو سمجھ سکے، اس لئے یہ دور خاموشی سے نظرانداز کردیا جاتا تھا' لیکن آہستہ آہستہ اس بات کا احساس و شعور بڑھتا گیا کہ انسان کی زندگی میں بچپن کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ اس کی بنیاد پر اس کی جوانی تعمیرو تشکیل ہوتی ہے۔ اس لئے فرانس کے مورخوں نے خصوصیت سے بچپن کے تصور اور تاریخ پر توجہ دی ہے اور اس بات کی کھوج لگائی کہ انسانی تاریخ میں مختلف ادوار اور زمانوں میں بچپن کو کس نقطہ نظریا انداز سے دیکھا جاتا ہے۔ اس تحقیق کے نتیجہ میں تاریخ میں بچپن کے ارتقاء کو ان ادوار میں تقسیم کیا گیا ہے۔

۱۔ ابتدائی عہد میں معاشروں میں بچوں کو قتل کرنے یا مارڈالنے کا رواج تھا۔ یہ زمانہ قدیم سے ۱۰۰۰ء تک رہا۔

۲۔ ایک ہزار عیسوی سے یہ رواج ہوا کہ امراء اپنے بچوں کو نرسوں' ملازموں اور دوسروں کے پاس تربیت کے لئے چھوڑ دیتے تھے۔

۳۔ ۱۵۰۰ء میں جاکر اس رواج میں تبدیلی آئی اس لئے یہ عبوری دور ہے۔

۴۔ بچوں کے معاملات میں بڑے پوری طرح سے دخل دیتے تھے۔

۵۔ بڑوں اور بچوں کے درمیان سماجی تعلقات کی ابتداء ہوئی۔

۶۔ جدید دور میں بچوں کی نفسیات کو سمجھا گیا۔

چونکہ بچوں کو ابتداء ہی سے نظرانداز کیا گیا۔ اس لئے ان کی تاریخ لکھنے میں

ماخذوں کی کمی ہوئی بہت کم تحریری مواد ہے کہ جس میں بچپن کے بارے میں معاشرے کے رجحانات کا پتہ چلتا ہے۔ بڑے لوگوں اور شخصیتوں کے بچپن کا تذکرہ ضرور ملتا ہے' مگر انہیں بڑا اور عظیم ثابت کرنے کے لئے ان سے مبالغہ آمیز روایات کو منسوب کردیا گیا ہے۔ بلکہ بعض اوقات تو ان سے ایسی باتیں متعلق کردی گئیں کہ وہ بچپن میں بھی دانا اور بالغ نظر معلوم ہوتے ہیں۔ تحریری ماخذ کی اس کمی کو مورخوں نے مجسموں اور تصاویر' ادب ' قانون اور تعلیمی نصاب' رسومات اور طب کے ذریعہ پورا کرنے کی کوشش کی ہے کہ ان میں بچوں کو کس طرح سے دیکھا گیا ہے۔

اس موضوع پر بنیادی کام مشہور فرانسیسی مورخ فلپ اریز نے کیا ہے جو اس کی کتاب "بچپن صدیوں کی روشنی میں" میں ہے۔ اس کی تحقیق کے نتیجہ میں وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ بچے زمانہ قدیم میں خوش تھے' کیونکہ اس وقت ان کی علیحدہ سے کوئی شناخت نہیں تھی اور وہ نوجوانوں اور بوڑھوں میں مل جایا کرتے تھے۔ قرون وسطی میں بچوں کا علیحدہ سے کوئی تصور نہیں تھا' وہ چھوٹے باشعوروں میں شمار ہوتے تھے۔ اس کے نزدیک جدید معاشرے میں بچوں کی آزادی گھٹ گئی ہے اور انہیں تربیت کے نام پر سخت سزائیں دی جانے لگی ہیں۔

فلپ اریز کے بعد اس موضوع پر اور دوسرے مورخوں نے بھی کام کیا ہے ان کے ان مضامین کا مجموعہ "بچپن کی تاریخ" کے نام سے ۱۹۷۵ء میں چھپا تھا جسے لائڈ دو ماؤز نے ترتیب دیا ہے ان مضامین میں بچوں کے بارے میں مختلف عہد میں جو رویے رہے ہیں اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

مثلاً" بچوں کو خوف زدہ کرنا یا ڈرانا ان کو خاموش کرنے یا ان سے کسی چیز کی پابندی کرانے کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا' ابتداء میں انہیں بھوتوں اور چڑیلوں سے ڈرایا جاتا تھا' یورپ میں اصلاح تحریک مذہب کے بعد انہیں خدا سے ڈرایا جانے لگا۔ جب مذہبی اثرات کم ہوئے تو بچوں کو ڈرانے کے لئے بھیڑیا' خوفناک جانور یا کالا آدمی آگیا۔ اکثر بچوں کی نرسیں کالا لباس پہن کر اور بھوت بن کر بچوں کو ڈراتی ہیں تاکہ وہ

ضد نہیں کریں اور سوجائیں۔ یہ بھی ہوتا تھا کہ عورتیں بچوں کو لے کر مجرموں کی پھانسی کا تماشہ دیکھنے جاتی تھیں۔

زمانہ قدیم سے لے کر جدید زمانہ تک بچوں کو قتل کرنے کا رواج تھا۔ اس میں جائز اور ناجائز دونوں قسم کے بچے شامل تھے اور انہیں مار کر انہیں کوڑے کے ڈھیر پر' دریا یا جنگل میں پھینک دیا جاتا تھا۔ بچہ اگر پیدائش کے وقت کمزور ہوتا تھا تو اکثر معاشروں میں اسے مار ڈالا جاتا تھا' لڑکیوں کو مارنے کا رواج زیادہ تھا اس وجہ سے آبادی میں توازن نہیں رہا۔ یورپ میں قرون وسطی تک یہ صورت تھی کہ مردوں کے مقابلے میں عورتیں کم تھیں۔

۴ عیسوی تک یونان اور روم میں بچوں کے قتل برا نہیں سمجھا جاتا تھا اور فلسفی بھی اس رواج کے حق میں تھے اور اس کی دلیل یہ تھی کہ جس طرح سے بیمار بھیڑوں کو اس لئے مار ڈالا جاتا ہے کہ وہ بقیہ گلے کو بیمار نہیں کریں اسی طرح سے کمزور بچوں کو مارنا صحیح ہے کیونکہ وہ صحت مند معاشرے کو خراب کرتے ہیں۔

زمانہ قدیم میں دیوی دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لئے بچوں کی قربانی کی جاتی تھی۔ پلوٹارک' مشہور رومی مورخ لکھتا ہے کہ لوگ خود اپنے بچوں کو قربانی کے لئے پیش کرتے تھے اور جن کے بچے نہیں ہوتے تھے وہ غریب لوگوں سے ان کے بچے خرید لیتے تھے اور بچوں کی قربانی کرتے تھے۔ قربانی کے طریقوں میں بچوں کو ذبح کرنا اور انہیں دیوار میں چننا شامل تھا' اکثر نئی عمارتوں اور پلوں کی بنیادوں میں بچوں کے خون کو شامل کیا جاتا تھا تاکہ وہ مضبوط رہیں اس کی شہادتیں ماہر آثار قدیمہ کو پرانی بلڈنگوں کے آثاروں میں ملے ہیں کہ جہاں بچوں کی ہڈیاں دفن تھیں۔ بچوں کو جادو کے لئے یا دوا کے لئے بھی قتل کیا جاتا تھا۔

اس رسم کے خلاف ۳۷۴ عیسوی میں جاکر قانون بنا اور بچوں کا قتل ممنوع ہوا۔ قتل کے ساتھ ساتھ بچوں کی فروخت بھی ہوا کرتی تھی۔ روس میں یہ رسم انیسویں صدی میں جاکر ختم ہوئی۔ یہ بھی دستور تھا کہ بچوں کو سیاسی طور پر بطور یرغمال دیا جاتا

تھا یا قرض کے عوض انہیں قرض خواہ کے حوالے کردیا جاتا تھا۔ بچوں کو والدین اس لئے اپنے سیاسی و معاشی مقاصد کے لئے استعمال کرتے تھے کیونکہ وہ انہیں اپنی ملکیت سمجھتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ اگر یہ دے دیئے جائیں گے تو دوسرے بچے پیدا کئے جاسکیں گے۔

بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے یہ رواج بھی تھا کہ انہیں دوسرے خاندانوں میں پرورش کے لئے بھیج دیا جاتا تھا۔ بطور ملازم امراء کے ہاں رکھے جاتے تھے تاکہ اچھی زبان سیکھیں، صحت مند رہیں اور اطاعت گذاری اختیار کریں۔ چونکہ امراء کی عورتیں بچوں کو دودھ پلانا گناہ تصور کرتی تھیں' اس لئے یہ بچوں کو نرسوں کے حوالے کردیتی تھیں بچوں کو رونے سے روکنے کی خاطر انہیں افیم دی جاتی تھی۔

سولھویں صدی میں اٹلی میں متوسط اور امراء کے طبقے بچوں کی پرورش اور تربیت کے لئے انہیں نرسوں کے حوالے کردیتے تھے' نرسوں کے انتخاب میں احتیاط برتی جاتی تھی کہ اس کا کردار اچھا ہو' ایماندار اور تمیز دار ہو' شرابی نہ ہو۔ نرسوں کی وجہ سے بچے کی تربیت میں ماں کا کردار نہیں رہتا تھا۔ نرسوں کو دودھ پلانے کے لئے اس لئے رکھا جاتا تھا کیونکہ اس وقت یہ خیال تھا کہ گائے یا دوسرے جانوروں کا دودھ پی کر بچہ بے وقوف ہوجاتا ہے۔ دائی کو گھر پر رکھا جاتا تھا اور بچہ کو ۲ سال کے لئے اس کے حوالے بھی کردیا جاتا تھا اس طرح بچہ ۲ سال بعد گھر آتا تھا۔

اس بات کا خیال رکھا جاتا تھا کہ بچہ کی صحت و تربیت ٹھیک ہو اس لئے اسے سادہ کھانا دیا جاتا تھا جو وہ کھڑے ہوکر کھاتا تھا۔ اسے ۶ سے ۸ گھنٹے تک سونے کی اجازت تھی۔ لڑکے کو خاندان میں وارث کی حیثیت سے تربیت دی جاتی تھی' جب کہ لڑکی کی تربیت گھریلو ذمہ داریاں سنبھالنے کی حیثیت سے کی جاتی تھی۔

بچوں کی پیدائش میں عورت کی ذمہ داری بہت رہی ہے' وہ پیدائش کے وقت سخت اذیت اور تکلیف سے دوچار ہوتی تھی۔ اس لئے سترھویں صدی کے ایک ولی نے عورت کے بارے میں کہا تھا کہ اس کا رحم موت کا گھر ہوتا ہے۔ مگر ہر معاشرہ میں

عورت سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ بچے پیدا کرے۔ بانجھ عورت کی معاشرے میں کوئی عزت نہیں ہوتی ہے اور وہ عورت بھی کہ جو وارث لڑکا پیدا کرنے میں ناکام ہوجائے۔ ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ اس جرم میں عورت کو قتل کردیا گیا' ایک مثال تو ہنری ہشتم کی ہے جس نے اپنی ملکہ این بولین کو اسی وجہ سے مروا دیا۔

انیسویں صدی میں جاکر یورپ میں بچوں کے بارے میں جاننے کا شوق ہوا اور روشن خیالی کے دور میں روسو نے کہا کہ محض بچے پیدا کرنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ان کی تربیت بھی بہت ضروری ہے اور بچوں کی تربیت میں صرف مائیں ہی نہیں باپ بھی حصہ لیں۔

لہٰذا جدید دور میں بچوں کی علیحدہ شناخت کو تسلیم کرلیا گیا ہے۔ لہٰذا اب ہر پہلو میں ان کی عمر' اور اس لحاظ سے ان کی ذہنی حالت کو دیکھتے ہوئے' ان کی تعلیم و تربیت پر زور دیا جاتا ہے۔ جیسے جیسے معاشرے میں بچوں کی شناخت ابھری اس کا فائدہ تاجروں نے اٹھایا۔ اور ان کے کھلونے 'کتابیں اور لباس پر زور دیا جانے لگا۔ ان کی پسند کی فلمیں بننے لگیں۔ ان کے علیحدہ سے کھیل بنائے جانے لگے۔ اور ان کو خاندان میں اہم مقام دیا جانے لگا۔ تعلیم یافتہ گھرانوں میں بچوں کی رائے اور ان کی بات کا احترام ہونے لگا۔

تاریخ اور آنسو

تاریخ کا علم اب صرف سیاست' تمدن اور کلچر تک ہی محدود نہیں رہا ہے بلکہ اس نے اپنے دائرہ تحقیق میں انسانی جذبات کو بھی شامل کرلیا ہے۔ اور اس بات کا دعویٰ کرنے لگا ہے کہ وہ انسانی احساسات کی بھی تاریخ لکھ سکتا ہے۔ ایک زمانہ تک تو یہ سمجھا جاتا تھا کہ انسانی جذبات و احساسات کی تاریخی عمل میں کوئی زیادہ اہمیت نہیں ہوتی ہے لیکن جدید تحقیق نے اب اس بات کو ثابت کردیا ہے کہ انسانی معاشرے کی تشکیل میں وہ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اسی طرح سے انسانی احساسات و جذبات کے بارے میں معیار تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ انسان اپنے جذبات اور ان کی شدت کو چھپاتا نہیں تھا اور اگر اسے خوشی و تکلیف ہوتی تھی تو اس کا اظہار کردیتا تھا۔ اور اگر صرف آنسو بہانا چاہتا تھا تو بغیر کسی شرم کے لوگوں کے سامنے رو کر اپنے جذبات کو ظاہر کردیتا تھا اس لئے اگر صرف آنسو کے بارے میں تحقیق کی جائے تو یہ انسانی تاریخ میں' انسانی رویوں کے بارے میں حیرت انگیز انکشافات کرے گی۔

انسانی آنسو اس وقت بہتا ہے جب کہ وہ انتہائی دکھ' تکلیف اور مصیبت کے عالم میں ہو یا اسے انتہائی خوشی و مسرت ہو' اس لئے ان آنسوؤں کی انسانی معاشرے میں بڑی قدر و قیمت ہے اور اردو شعراء تو ان آنسوؤں کو موتیوں سے تشبیہہ دیتے ہیں اور شاید یہی وجہ ہو کہ رومیوں میں یہ دستور تھا کہ جب وہ کسی کی موت پر تعزیت کرتے تھے تو اپنے غم کے اظہار میں چھوٹی شیشیوں میں اپنے آنسو پیش کرتے تھے جو

کہ سوگوار خاندان میں بطور یادگار رکھے رہتے تھے۔

ہمارے معاشرے میں اگرچہ آنسو بہانا بزدلی اور شرم کی بات سمجھی جاتی ہے خصوصیت سے مردوں کے لئے مگر دو مواقع ایسے ہیں کہ جن پر سب کے سب آنسو بہائے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو کسی کی موت پر جب کہ صدمہ اور غم سے انسان اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتا ہے اور دوسرے محرم کے دوران جبکہ کربلا کے واقعات کا تذکرہ ہو تو اس وقت آنسو بہا کر اور رو رو کر لوگ اہل بیت سے اپنی محبت و لگاؤ کا اظہار کرتے ہیں۔

این ونسٹ بوفو (A.V. Buffautt) نے اس موضوع پر ایک دلچسپ کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے "آنسوؤں کی تاریخ" جو ۱۹۹۱ء میں چھپی ہے اس میں اس نے یورپی معاشرے میں آنسوؤں کی تاریخ کو لکھا ہے اور ان رویوں کی نشاندہی کی ہے کہ جو وقتاً" فوقتاً" بدلتے رہے ہیں۔ اس نے کتاب کا مواد ناولوں، ذاتی ڈائریوں اور محبت بھرے خطوط سے حاصل کیا ہے جو کہ خاص طور سے فرانس میں اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی میں لکھے گئے تھے۔ اس کی تحقیق کے نتیجہ میں یورپی معاشرے میں آنسوؤں کے بارے میں دلچسپ انکشافات ہوئے ہیں۔

وہ سب سے پہلے تو اس بات کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ آنسوؤں کا لوگوں پر جو اثر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ دیکھنے والا خود بھی متاثر ہوجاتا ہے۔ اور اس کے دل میں اگر سختی ہوتی ہے تو وہ نرمی میں بدل جاتی ہے اگر دلوں میں دشمنی اور عداوت ہوتی ہے تو اس کے اثر سے وہ زائل ہوجاتی ہے اور یہ دو مخالفوں کو قریب لے آتے ہیں۔ اسی طرح سے اگر دو محبت کے مارے مل کر آنسو بہاتے ہیں تو ان کے آنسو ان کو اور قریب کردیتے ہیں اور ان کی محبت میں اس سے اضافہ ہوجاتا ہے۔ آنسوؤں میں اس قدر خلوص اور محبت ہوتی ہے اور اسی لئے ان میں اس قدر اثر اور طاقت ہوتی ہے کہ یہ دوسروں کو بھی متاثر کرکے انہیں اس بات پر مجبور کردیتے ہیں کہ وہ بھی آنسو بہانے پر مجبور ہوجائیں۔

اگرچہ یہ بھی صحیح ہے کہ بعض لوگ آنسوؤں کی اس اہمیت سے فائدہ اٹھا کر جھوٹے آنسو یا ٹسوے بہاتے ہیں۔ اور اپنے سامنے والے کو بیوقوف بنا کر اپنا کام نکال لیتے ہیں اس لئے ایسے آنسوؤں کو انگریزی میں مگرمچھ کے آنسو کہا جاتا ہے کہ جو ظاہری ہوتے ہیں اور جن میں کوئی خلوص نہیں ہوتا ہے۔

مصنفہ نے اس کی طرف نشان دہی کی ہے کہ فرانس میں اٹھارویں صدی تک یہ دستور تھا کہ لوگ تھیٹر میں المیہ سین پر رویا کرتے تھے اور اس میں فخر محسوس کرتے تھے کہ لوگ انہیں روتے ہوئے دیکھیں۔ فرانسیسی انقلاب کے دوران بھی لوگوں کے سامنے آنسو بہانا عام ہوگیا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ انقلاب نے ان روایات اور اقدار کو ختم کردیا تھا کہ جن میں ایک فرد گرفتار تھا' اب وہ خود کو آزاد محسوس کرتا تھا اور اس آزادی کا اظہار وہ اپنے جذبات سے کرتا تھا۔ وہ اس میں خوش تھا کہ وہ جس طرح سے محسوس کرتا ہے اسی طرح سے عمل کرتا ہے۔

لیکن انیسویں صدی کے آتے آتے یہ روایت ہوگئی کہ انسان کو اپنے جذبات پر قابو رکھنا چاہئے اور لوگوں کے سامنے آنسو نہیں بہانے چاہئیں اور یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ سائنسی ایجادات اور صنعتی انقلاب نے ایک نئے کلچر کو پیدا کیا کہ جس کی بنیاد عقل پرستی پر تھی اور جو جذباتیت اور اس کے اظہار کے خلاف تھا۔ کیونکہ ایک جذباتی شخص ایک اچھا کام کرنے والا نہیں بن سکتا تھا۔ صنعتی معاشرے کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی کہ جو کام کے دوران اپنے جذبات پر قابو رکھے اور خاموشی سے اپنے فرائض کو سرانجام دے۔

اس لئے اس دور میں آنسوؤں کے خلاف ایک تحریک چلی اور انہیں بری طرح سے تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ تاریخ اور سائنسی حوالوں سے یہ ثابت کیا گیا کہ رونا ایک برا اور قابل شرم فعل ہے۔ چارس ڈارون نے بھی اسی موضوع پر ایک جگہ لکھا ہے کہ ایک بالغ آدمی میں جسمانی تکلیف اس قدر نہیں ہوتی ہے کہ وہ آنسو بہانے پر مجبور ہوجائے۔ اس لئے چاہے وہ غیر متمدن لوگ ہوں یا تہذیب یافتہ وہ یہ اس بات کو

انتہائی برا سمجھتے ہیں کہ اپنی تکلیف کا دوسروں کے سامنے رو کر یا آنسو بہا کر اظہار کریں۔

اس لئے بالغوں کے لئے اور خصوصیت سے مردوں کے لئے آنسو بہانا کمزوری' بزدلی اور غیر مردانہ فعل ہوگیا۔ لیکن آنسوؤں کو اگر ان روایات کے تحت روک دیا گیا تب بھی انہوں نے خاص طور سے بچوں کی زندگی میں' اہم کردار ادا کیا ہے۔ چونکہ بچے چھوٹی عمر میں اپنی خواہشات کا اظہار زبان کے ذریعہ نہیں کرسکتے ہیں اس لئے وہ چیخ مار کر یا رو کر اپنی بات منوانے کی کوشش کرتے ہیں اس لئے بقول مصنفہ کے بچوں کے پہلے آنسو ان کی درخواست ہوتے ہیں لیکن اگر اس پر عمل نہ کیا جائے تو یہی آنسو احکامات بن جاتے ہیں۔ اس لئے بچے صرف اسی وقت روتے ہیں کہ جب اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ بلامبالغہ آنسو بہا کر مصیبت میں پڑنا نہیں چاہتے ہیں۔ اس لئے جیسے ہی بچے بولنا سیکھ لیتے ہیں وہ رونا کم کردیتے ہیں' کیونکہ اب وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ اپنے مطالبات اور تکلیف کو بیان کرسکتے ہیں۔"

اب جدید زمانے میں آنسوؤں کا کردار اور بھی بدل گیا ہے' اس کی جانب بوفو اشارہ کرتے ہوئے کہتی ہے کہ تعلیم اور تربیت کی وجہ سے اب لوگ اپنے جذبات پر قابو پانے لگے ہیں اور ان کا اظہار کرکے وہ اپنی کمزوری ظاہر کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ اگرچہ عورتیں ابھی تک آنسو بہاتی ہیں اور اسی لئے انہیں کمزور اور حساس سمجھا جاتا ہے کہ وہ موجودہ دور کی سختیوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی ہیں۔

عورتیں اور آنسو

آنسوؤں کی وجہ سے معاشرہ میں عورت اور مرد کی شخصیت کا تعین کیا جانے لگا ہے کیونکہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ روایت ہوگئی کہ آنسو بہانا کمزوری کی نشانی ہے' لہٰذا چونکہ عورت ایک کمزور ذات ہے اس لئے وہ اپنے آنسوؤں پر قابو نہیں پاسکتی ہے اور مجمع میں یا تنہا آنسو بہاتی ہے۔ عورت نے بھی اس سے فائدہ اٹھایا اور آنسو بہانے کو

بطور مزاحمتی ہتھیار استعمال کیا۔ کیونکہ ایک ایسے معاشرے میں کہ جہاں مکمل طور پر مرد کی بالادستی ہو' وہاں وہ آنسوؤں کے ذریعہ مرد کو متاثر کرکے اپنے حقوق مانگ سکتی ہے' اس لئے مردوں نے عورتوں کے آنسو بہانے کو حیلہ و فریب جانا اور اس کی سختی سے مزاحمت کی' اردو زبان میں اس لئے ٹسوے بہانے کا محاورہ رواج پایا۔ مرد سمجھتا ہے کہ اس طرح سے عورت اسے جال میں پھنسا رہی ہے' اس لئے عورت کے آنسو بہانا بھی قابل تعریف نہیں رہا اور "ڈکشنری آف سوسائٹی" میں آنسوؤں پر جو مقالہ ہے اس میں مصنف کہتا ہے کہ "یہ وہ ذریعہ ہے کہ جس کے ذریعہ عورت اپنی بے وفائی کو چھپاتی ہے یا ان کی مدد سے اپنے لئے کشمیری شال حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اس ہتھیار کو عورتیں کامیابی کے ساتھ استعمال کرتی ہیں۔"

اس لئے کہا جاتا ہے کہ جو عورتیں بہت زیادہ آنسو بہاتی ہیں آخر کار وہ اپنی طاقت کھودیتی ہیں اور مرد ان سے متاثر نہیں ہوتے۔

چونکہ آنسو کمزوری کی علامت بن گئے' اس لئے مردوں نے کوشش کی کہ آنسو بہانے سے خود کو روکیں' خاص طور سے لوگوں کے سامنے۔ کیونکہ آنسو بہانے کا مطلب تھا کہ خود کو عورتوں اور بچوں کی طرح سے کمزور ثابت کردیا جائے۔ اسی لئے چاہے ان کے جذبات کسی قدر شدید کیوں نہ ہوں وہ رنج و غم کی شدت سے مجبور ہی کیوں نہ ہوں اس کا اظہار وہ آنسوؤں کی شکل میں کرنے سے گریز کرنے لگے۔

عہد سلطنت کے مشہور مورخ ضیاء الدین برنی نے بلبن کا واقعہ لکھا ہے کہ جب اسے اپنے لڑکے سلطان محمد شہید کے قتل ہونے کی اطلاع ملی تو اس نے دربار میں اور لوگوں کے سامنے اس خبر کو خاموشی اور صبر سے سنا اور کسی قسم کے جذبات کا مظاہرہ نہیں کیا۔ لیکن جیسے ہی وہ تنہا ہوا وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں پاسکا اور پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔

ہمارے معاشرے میں مرد کسی کی موت پر تو سب کے سامنے آنسو بہالیتا ہے مگر اس کے علاوہ وہ ان پر قابو رکھتا ہے کیونکہ اسے فوراً" یہ طعنہ مل جاتا ہے کہ اس میں

نسوانی خصوصیات آگئی ہیں۔ یا عورتوں کی طرح سے رونا شروع کردیا ہے۔ لہٰذا آنسوؤں کی بنیاد پر مرد اور عورت کے درمیان اور زیادہ فرق قائم ہوا اور یہ کہا جانے لگا کہ چونکہ عورت جذباتی طور پر کمزور ہوتی ہے س لئے وہ روتی ہے جب کہ مرد اپنے جذبات پر قابو پالیتا ہے جو کہ طاقت کی نشانی ہے۔ اس لئے وہ عورت سے برتر اور افضل ہے۔

اس نظریہ کی وجہ سے آنسوؤں کی قدروقیمت معاشرہ میں کم ہوگئی۔ اور اس کی وجہ سے عورت کا رتبہ اور اس کی حیثیت بھی کم ہوگئی۔ ایک دانشور نے اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہا کہ "عورت دکھ اٹھاتی ہے' عبادت کرتی ہے اور نیک عمل میں مصروف رہتی ہے۔ جبکہ مرد خدائی احکامات سے گریز کرتا ہے۔ دونوں کا اپنا اپنا علیحدہ کردار ہے۔ عورت دکھ اٹھانے کے لئے بنی ہے۔ اور مرد کی طبیعت میں دکھوں کا مقابلہ کرنا ہے۔

اب جدید تحقیق یہ کہتی ہے کہ اگر انسان سخت جذباتی کیفیت میں ہو تو اس کے لئے بہتر ہے کہ وہ آنسو بہالے' کیونکہ آنسوؤں پر قابو پا کر وہ اندر سے گھٹ کر رہ جائے گا۔ جس طرح سے حبس ہو اور بادل برس جائیں تو موسم خوشگوار ہوجاتا ہے۔ اسی طرح سے آنسو اندر سے گردو غبار اور گھٹن کو صاف کر دیتے ہیں۔ آنسو بہانے کو اب کمزوری نہیں سمجھا جاتا بلکہ اسے ایک فطری عمل سمجھتے ہیں کہ جو خوشی و مسرت اور درد و رنج کے فرق کو ظاہر کرتا ہے۔ اس لئے عورتوں میں یہ جرات و ہمت ہے کہ وہ اپنے جذبات کا اظہار آنسو بہا کر کرتی ہیں۔ اور انہیں روک کر اپنی شخصیت کو مصنوعی خول میں بند نہیں کرتی ہیں۔

اس لئے آنسو بہانا ایک فطری عمل ہے۔ اور مرد و عورت میں اس طرح سے کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں رنج و مسرت کو محسوس کرتے ہیں اور اس کا اظہار بھی کرنا چاہتے ہیں۔ مگر معاشرہ کی روایات ان کے آڑے آتی ہیں۔ لہٰذا مردوں کا کام ہے کہ وہ اس مصنوعی خول کو اتار دیں اور اپنے جذبات کا اظہار اگر آنسو بہا کر کرنا پڑے تو ضرور کریں۔

○

تاریخ اور افواہیں

جب کبھی کوئی حکومت اس بات کی کوشش کرتی ہے کہ لوگوں سے اصل واقعات اور حقائق کو چھپائے تو اس صورت میں ان کی جگہ افواہیں لے لیتی ہیں جو فوراً ایک سرے سے دوسرے سرے تک آن واحد میں پھیل جاتی ہیں اور لوگوں کے جذبات اور احساسات کو ظاہر کرتی ہیں۔ ان افواہوں کی خاص بات یہ ہوتی ہے کہ یہ کبھی پتہ نہیں چلتا ہے کہ ان کی ابتداء کہاں سے ہوئی ہے' اس لئے یہ ہمیشہ کسی ایک فرد یا ادارے سے منسوب نہیں ہوتی ہیں بلکہ عوام کی نمائندگی کرتی ہیں۔ اسی طرح سے اس کی کبھی تصدیق نہیں ہوپاتی ہے اور لوگوں میں اسے حقیقت اور سچائی کے طور پر تسلیم کرلیاجاتا ہے اور ہوتا یہ ہے کہ جس قدر حکومت اس سے انکار کرتی ہے اسی قدر لوگوں میں اس کے بارے میں یقین بڑھتا جاتا ہے۔

افواہوں کو دو وجوہات کی بناء پر تقویت ملتی ہے ایک تو اس بات سے کہ جب بھی حکومت بحران کے وقت اپنے عوام کو حقائق سے آگاہ نہیں کرتی ہے اور یہ خیال کرتی ہے کہ حقائق کی آگہی سے اس کی کمزوری سامنے آئے گی تو اس کے اس رویہ سے لوگوں میں شک و شبہات پیدا ہوتے ہیں اور یہ وہ فضا ہوتی ہے کہ جس میں افواہوں کو پھیلنے کا پورا پورا موقع ملتا ہے۔

دوسرے ایک معاشرے میں کہ جہاں لوگوں کی اکثریت ان پڑھ ہو' تو وہاں افواہ جو زبانی ذرائع سے پھیلتی ہے وہ تحریری لفظ سے زیادہ محترم ہوجاتی ہے اور لوگ اس پر یقین کرنے لگتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ افواہیں تمام کی تمام غلط ہی نہیں

ہوتی ہیں بلکہ یہ جب درست نکلتی ہیں تو اس سے ان کی صداقت اور مستحکم ہوجاتی ہے۔

اکثر افواہیں بحرانوں کی وجہ سے زیادہ پھیلتی ہیں مثلاً" اگر قحط پڑجائے ' بغاوت ہوجائے' جھگڑے ہوں یا جلسے و جلوس نکالے جاتے ہوں یا حکومت کی جانب سے جابرانہ و پرتشدد قوانین کا نفاذ کیا جائے تو ایسے موقعوں پر عوام افواہوں کے ذریعہ اپنے جذبات' اپنا غم و غصہ اور اپنے مطالبات کا اظہار کرتے ہیں اور یہ وہ ہتھیار ہوتا ہے کہ جس کے ذریعہ وہ مزاحمت کرتے ہیں ' لڑتے ہیں اور حکومت کے جبر کا مقابلہ کرتے ہیں۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جابر سے جابر حکومتیں بھی عوام کی اس مزاحمت کے آگے 'یعنی افواہوں کے توڑ میں ناکام رہی ہیں۔ قدیم ہندوستان کے مشہور دانش ور کوٹلیہ نے اپنی کتاب ارتھ شاستر میں خصوصیت سے بادشاہ کو یہ نصیحت کی ہے کہ وہ اپنے جاسوسوں کے ذریعہ ملک میں پھیلنے والی افواہوں کی خبر رکھیں کیونکہ یہ بادشاہ کی حیثیت کو کمزور کرسکتی ہیں۔

مغل دور حکومت میں بھی شاہی خاندان کے بارے میں افواہیں پھیلتی رہتی تھیں اور یہ افواہیں لوگوں میں بہت مقبول تھیں۔ منوچی نے جو کہ شاہ جہان اور اورنگ زیب کے زمانہ میں ہندوستان تھا اور ایک اطالوی سیاح تھا ایسی بہت سی افواہوں کا ذکر کیا ہے جو کہ دارا اور اورنگ زیب کی کشمکش کے وقت مشہور تھیں یا اورنگ زیب کی لڑکی زیب النساء کے بارے میں تھیں۔

ہندوستان میں برطانوی عہد میں بھی افواہوں کی بہتات تھی' اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اہل برطانیہ غیر ملکی تھے اور مقامی لوگوں سے دور رہتے تھے۔ اس لئے ان کے بارے میں افواہوں کا پھیلنا بہت عام تھا۔ جیسا کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے یہ افواہ زور و شور سے گردش کرنے لگی کہ حکومت ہندوستانیوں کو زبردستی عیسائی بنانے لگی ہے اس افواہ نے لوگوں میں بے چینی پیدا کردی اور وہ حکومت کے ہر قدم پر شبہ کرنے لگے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ کے دوران باغی راہنماؤں کا سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ لوگوں کو کس طرح سے متحد کیا جائے اور انہوں نے ایسے اقدامات بھی کئے کہ جن کی وجہ سے ہندو مسلمان ایک دوسرے کے قریب آئے' لیکن ساتھ ہی میں افواہوں نے ان کو انگریزوں کے خلاف اور زیادہ متحدہ کردیا کیونکہ اس زمانہ میں یہ پھیل گیا تھا کہ انگریزی حکومت نے کنوؤں میں سور اور گائے کا گوشت پھینک دیا ہے کہ پانی آلودہ ہوجائے اور ہندو و مسلمان دونوں کا مذہب خراب ہو۔ یا یہ افواہ کہ حکومت کے حکم پر آٹے میں ہڈیوں کو پیس کر ملا دیا ہے اور اس کے ذریعہ سے لوگوں کے مذہب کو خراب کرنے کا منصوبہ ہے۔اور پھر یہ افواہ بھی پھیلی کہ بڑے صاحب نے ہندو و مسلمان امراء اور والیان ریاست کو انگریزی روٹی کھانے پر مجبور کیا کہ جو ہڈیوں کے آٹے کی تیار ہوتی تھی۔

ان افواہوں نے لوگوں کے جذبات کو انگریزوں کے خلاف کیا اور چونکہ انہوں نے اہل ہندوستان کے مذہب کو خراب کرنے کی کوشش کی اس لئے ان کے دشمن قرار پائے اور ان کی مخالفت ثواب ٹھہری۔ اس زمانہ میں یہ افواہ بھی پھیلی کہ ایران کا بادشاہ ایک بڑی فوج لے کر ہندوستان آرہا ہے تاکہ انگریزوں سے لڑ سکے اور انہیں ہندوستان سے باہر نکال دے۔ ان افواہوں نے وقتی طور پر ہندوستان کو انگریزوں سے لڑنے کا حوصلہ ضرور دیا۔

اس طرح سے ۸۸ - ۱۸۸۷ء یعنی افغانستان سے جنگ کے وقت ہندوستان میں بہت زیادہ افواہیں پھیلیں۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ جنرل رابرٹ قتل ہوگیا ہے اور اس کی پوری فوج تباہ ہوگئی ہے جب کہ جنرل اور اس کی پوری فوج زندہ و صحیح سالم تھی۔ اس صورت حال پر ایک برطانوی مورخ جان کے نے لکھا ہے کہ "یہ ایک حقیقت ہے کہ ہندوستان میں کچھ خبریں ایک اسٹیشن سے دوسرے اسٹیشن بڑی تیزی سے سفر کرتی ہیں اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ ان میں بجلی جیسی تیزی ہوتی ہے۔ حکومت کی کسی خبر سے پہلے بازار اور لوگوں میں اور عام سپاہیوں میں خبر پہلے پہنچ جاتی

ہے۔ اور اگر یہ خبر برطانوی تباہی کی ہو تو اس کے پھیلنے میں اور تیزی آجاتی ہے۔ اور ہم ان خبروں اور ان کو اس تیزی سے پھیلنے کے عمل کو روکنے سے قاصر ہیں۔

اس لئے اگر دیکھا جائے تو افواہیں ایک پیمانہ ہیں کہ جن سے حکومتوں کی مقبولیت یا غیر مقبولیت کا اندازہ اس وقت کی افواہوں سے لگایا جاسکتا ہے' کیونکہ ان میں حکومت کے خلاف عوام کا غم و غصہ اور ان کی بداعتمادی صاف جھلکتی ہے۔ اگر وہ حکومت اور اس کی پالیسیوں کو پسند نہیں کرتے ہیں تو اس کا اظہار افواہوں میں ہوتا ہے۔

چنانچہ آمرانہ حکومتوں کے دوران پاکستان بھی افواہوں کا مرکز رہا ہے۔ ایوب خان کے زمانہ میں جب آبادی کے کنٹرول کے سلسلہ میں اس کی حکومت کی پالیسی کو پسند نہیں کیا گیا تو یہ افواہ پھیلی کہ حکومت نے چائے میں ایسی دوا ملا دی ہے کہ لوگوں کے اولاد پیدا نہ ہو اس سے عام لوگ اس قدر پریشان ہوئے کہ انہوں نے ہوٹلوں میں چائے پینا چھوڑ دی۔

اس لئے افواہ ایک قسم کا مزاحمتی ہتھیار ہے کہ جو نہتے عوام جبر و تشدد کے خلاف استعمال کرتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں جو انتشار' بے چینی اور افراتفری پھیلتی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس ہتھیار میں کسی قدر جان ہے۔

○

تاریخ اور وقت کا تصور

انسانی تاریخ کی ابتداء میں وقت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ انسان زمانہ حال میں پیدا ہوتا تھا اور اسی میں مرتا تھا اور جب کوئی ماضی نہیں تھا تو کوئی تاریخ بھی نہیں تھی' تاریخ کا تصور اور احساس اس وقت ہوا کہ جب وقت کے بارے میں انسان کے خیالات کا ارتقاء ہوا۔ لہٰذا ہر قوم میں اس کے جغرافیائی اور سماجی حالات کے تحت وقت کا تصور ابھرا۔ جیسے جیسے انسانی معاشرے سماجی طور پر ترقی کرتے گئے اسی طرح سے موسموں کی تبدیلی' زراعتی تجربات اور فصلوں کی تیاری اور ستاروں کی گردش نے انسان کو وقت کے بارے میں حساس کیا۔ چنانچہ وقت کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا گیا اور اسی حساب سے انسان نے اپنی یادداشتوں کو محفوظ کرنا شروع کر دیا۔

مثلاً" قدیم مصر میں ابتدائی دور میں وقت کا کوئی تصور نہیں تھا اس لئے مصریوں کے لئے دنیا ہمیشہ سے تھی اور ہمیشہ رہنے والی تھی۔ کیونکہ وقت کے بغیر ان میں تبدیلی کا بھی احساس نہیں تھا۔ اس لئے مصریوں نے کبھی بھی اس بات کی کوشش نہیں کی کہ اپنے سماجی و سیاسی اداروں کے ارتقاء کے بارے میں سوچیں یا ان کا تجزیہ کریں ان کے مطابق یہ ادارے اور قدریں ترقی یافتہ شکل میں پیدا ہوگئی تھیں وہ ان کے ارتقائی عمل سے ناواقف تھے' اس وجہ سے مصریوں کا دنیا کے بارے میں جو نقطہ نظر تھا وہ ٹھہرا ہوا تھا اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

ان کے مقابلہ میں اہل سمیریا اور بابل والوں کا دنیا کے بارے میں دوسرا تصور تھا' کیونکہ ان کے ہاں سیلاب' بارشیں اور فطری آفات زبردست تبدیلیاں لاتی تھیں' اس

لئے ان کے ہاں ایک تو تبدیلی کا احساس تھا کہ کس طرح فطری آفات پورے معاشرے کو بدلتی ہیں' دوسرا عدم تحفظ کا احساس تھا کہ جو پورے معاشرے پر حاوی تھا اور مسلسل تبدیلیوں کی وجہ سے انہیں فنا کا ڈر بری طرح سے ستاتا رہتا تھا۔ ان کے ہاں کسی چیز کو قرار نہیں تھا انسان فطرت کے سامنے بے بس و مجبور تھا وہ اس قدر کمزور تھا کہ اس سے مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ اس لئے اس نے مقابلہ کرنے کے لئے ایسی قوتوں کی مدد طلب کی اور اپنی بقاء کی خاطر اس نے اپنی روح کو دیوتاؤں کی روحانی طاقتوں کے حوالے کردیا۔

اہل سمیریا تباہیوں میں گھرے ہوئے ڈر اور خوف کی حالت میں اپنے اس سنہرے ماضی کو یاد کرتے تھے کہ جب وہ تمام خطرات سے آزاد تھے۔ وہ کہتے تھے کہ

"ایک زمانہ تھا کہ جب کوئی سانپ نہیں تھا
کوئی بچھو نہیں تھا' کوئی لکڑ بھگا نہیں تھا' اور کوئی شیر نہیں تھا
کوئی جنگلی کتا نہیں تھا' اور کوئی بھیڑیا نہیں تھا
وہاں کوئی ڈر نہیں تھا
انسانوں کا کوئی دشمن نہیں تھا

اہل روم چونکہ اتھارٹی کی عزت کرتے تھے اور انہیں اپنی روایات پر فخر تھا اس لئے وہ کسی ایسی تبدیلی کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھے کہ جو ان کی روایات یا قدروں سے متضاد ہو۔ اس لئے ان کے معاشرہ میں تقلید کو سب سے بڑی خوبی سمجھا جاتا تھا اس لئے وہ ماضی کی قدر کرتے تھے اور اس کا احترام ان کے دلوں میں بیٹھا ہوا تھا۔

یہی رجحان اہل چین کا تھا جن کا تاریخ کے بارے میں یہ خیال تھا کہ اس میں تمام واقعات اکٹھے ہوکر مل گئے ہیں۔ اور ہر چیز جو بھی ماضی میں ہوئی ہے۔ وہ بغیر کسی گڑبڑ کے ہوگئی ہے چونکہ بادشاہ ان کے نزدیک آسمانوں کا بیٹا تھا' جو کہ تاریخ کے ہر عمل کو کنٹرول کرتا تھا۔ اس لئے اس کے نقطہ نظر کو دربار کے بیوروکریٹ اپنی تاریخ میں بیان کرتے تھے۔

یورپ میں قرون وسطیٰ کے زمانہ سے لے کر رنیا ساں اور ریفارمیشن کے زمانہ تک تاریخ کا نقطہ نظر مذہبی تھا' جو کہ ماضی میں سنہرے دور پر مبنی تھا اور اس لحاظ سے قدامت پرستانہ تھا جیسا کہ مارٹن لوتھر کی اس تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا زوال پذیر ہو رہی ہے اور اس کا ہر آنے والا دن تباہی کا باعث ہے۔ حضرت آدمؑ پر جو مصیبتیں آئیں ان کے مقابلہ میں ہماری مصیبتیں زیادہ نقصان دہ ہیں۔ وہ شکایت کرتا ہے کہ طوفان نوح کے بعد دنیا کے درخت اور پھل انتہائی خراب ہیں اور ہم ان کا ماضی کے درختوں اور پھلوں سے مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں۔

اس قدامت پسند نقطہ نظر کی وجہ سے معاشرہ کو تبدیل کرنے کی بجائے اور قدیم و خستہ روایات توڑنے کی بجائے یہ کوشش تھی کہ حالات کو ایسا ہی رہنے دیا جائے اور معاشرے کے ڈھانچہ و قدروں کو تبدیل نہیں کیا جائے۔ اس نقطہ نظر کا اظہار ان خطابات سے بھی ملتا ہے کہ جو اس دور کے حکمران اختیار کرتے تھے ان میں "دفاع کرنے والا' روایات کو سنبھالنے والا اور بنیاد رکھنے والا" خطابات تھے۔ ان حکمرانوں کی پالیسی یہ تھی کہ ماضی کے سنہری دور کو واپس لایا جائے ' بجائے اس کے کہ اصلاحات کے ذریعہ تبدیلی لائی جائے۔

سترھویں صدی میں جاکر یہ قدامت پسندانہ نظریہ تبدیل ہوا اور اس کی جگہ ترقی کا نظریہ مقبول ہوا' انیسویں صدی میں اس نظریہ کے زیر اثر یہ سمجھا جانے لگا کہ تاریخ بغیر کسی رکاوٹ کے سیدھی آگے کی جانب بڑھ رہی ہے اس نظریہ کو تقویت دینے میں اس وقت کی بیولوجیکل نظریات کو بھی دخل تھا۔

جے جے وٹرو نے اپنی کتاب "وقت اور تاریخ" میں جو آکسفورڈ سے ۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی ہے' اس بات کی نشان دہی کی ہے کہ ہماری آگہی کی سرحدیں وقت کے بارے میں ہماری واقفیت کے ساتھ بڑھ رہی ہیں کیونکہ وقت کے تصور کے ساتھ ہی تاریخ کے بارے میں ہماری معلومات میں اضافہ ہو رہا ہے۔ وقت کا یہ تصور تاریخ میں تقویم کو روشناس کرانے کا باعث ہوا اور اس کے ساتھ ادوار کی تقسیم عمل میں آئی۔

ماضی اور وقت ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے ہیں اور وقت کے تصور کے بغیر ہم تاریخ اور اس کے عمل کو نہیں سمجھ سکتے ہیں۔